مذہب اور جدید چیلنج

جس میں علمی اور جدید سائنسی تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اسلامی عقائد کا اثبات اور مخالفین مذہب کو چیلنج کیا گیا ہے۔

مولانا وحید الدین خان

دار التذکیر

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون نمبر 92-042-723-1119

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اگلے صفحات پر جس موضوع پر بحث ہے وہ اردو زبان میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے، مگر مصنف کا حساس ہے کہ اس سلسلے میں اب تک ہمارے یاں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں بعض قابل قدر اجزاء ہونے کے باوجود کچھ نقائص پائے جاتے ہیں اور یہی چیز ہے جو اس کتاب کا محرک ہوئی۔

جدید دور کو، جہاں تک اس کے مخالف مذہب ہونے کی حیثیت کا تعلق ہے، دور الحاد کہا جاتا ہے، مگر اس الحاد کا مطلب ایک مدعیانہ انکار نہیں ہے، بلکہ اس کی اپنی تشریح کے مطابق، یہ محض ایک طریقہ مطالعہ ہے، جو ذہنی اور علمی ارتقاء کے ایک مخصوص دور میں انسان کو حاصل ہوا ہے، اس ارتقائی مطالعہ کا لازمی تعلق کسی چیز کے انکار یا اثبات سے نہیں ہے، بلکہ وہ مجرد ایک طریق جستجو ہے یہ الگ بات ہے کہ جدید مفکرین کے نزدیک اس طریق جستجو نے مذہب کو باطل ثابت کر دیا ہے، یہاں میں مائلز (T.R.MILES) کے الفاظ نقل کروں گا۔

''موجودہ رجحان ایک ٹکنیک، ایک طریقہ، سوالات کے مطالعہ کے ایک ڈھنگ کی طرف ہے، نہ کہ مسائل کا قطعی جواب دینا، یہ ایک نمایاں تبدیلی ہے جو پچھلی نصف صدی کے اندر فلسفہ کی دنیا میں ہوئی ہے، یہ صورت حال ابھی بھی جاری ہے، اور بہت دور تک اس میں ٹھہراؤ کی امید نظر نہیں آتی:

(religion andthe scientific out look.(۱۹۵۹)P_۱۳)

جدید مفکرین کی اپنے موقف کے بارے میں یہ تشریح، خواہ اسے ہم ایک علمی بات سمجھیں یا اس کو یہ حیثیت دیں کہ مذہب بیزاری کے بعد کائنات کی مادی توجیہ ڈھونڈنے میں انسان کو جو ناکامی ہوئی ہے، اس کے بعد یہ ایک خوب صورت جائے

پناہ ہے، جو اس نے تلاش کی ہے، بحر حال ہماری مدافعانہ کوششوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس صورحال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کام کریں۔

مثال کے طور پر اثبات رسالت کے عنوان پر یہاں جو کام ہو رہا ہے، اس میں اکثر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ دور جدید کا یہ دعویٰ ہے ''کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے رسول تھے'' اور اس کے بعد آپ کو ''سچا'' ثابت کرنے پر مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا جاتا ہے، حالانکہ جھوٹا نبی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سچا نبی بھی ہوتا ہے، جب کہ جدید انسان اپنے معلوماتی دائرہ کے مطابق ایسی کسی چیز کے ماننے ہی میں مشتبہ ہے، دراصل جھوٹا رسول (fals prophet.) یہود و نصاریٰ کے مذہبی طبقہ کا پرانا اعتراض ہے جو اپنے انبیاء کی نبوت کو مانتے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہیں ورنہ جہاں تک جدید ملحدانہ ذہن کا تعلق ہے، اس کے لیے اصل مسئلہ آپ کے ''جھوٹے'' یا ''سچے'' ہونے کا نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ آپ کے کلام نبوت کا سرچشمہ کیا ہے، وہ اپنے معلوم ذرائع پر قیاس کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا سرچشمہ انسان کا اپنا شعور ہے، اور لاشعور سے نکلے ہوئے کلام کو وحی و الہام سے تعبیر کرنا محض ایک استعارہ ہے نہ کہ کسی حقیقتواقعہ کا بیان۔

اس لیے رسالت کی بحث میں صرف آپ کو ''سچا'' ثابت کرنے سے جدید تقاضے کی تکمیل نہیں ہوتی، بلکہ ہمیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ الہام کوئی حقیقی چیز ہے، وہ مخصوص انسانوں پر اترتا ہے، اور اسی کے اعتبار سے آپ خدا کے رسول تھے۔

یہ تو اس صورت حال کی مثال تھی، جب کہ جدید فکر کے اصل موقف کو صحیح طور پر سامنے رکھے بغیر اس پر تنقید کی جائے، لیکن ایک اور ذہن ہے، جو جدید فکر سے واقف ہونے کے باوجود دوسری قسم کی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ لوگ اپنی

مرعوبیت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی اماموں کے نزدیک جن تصورات کو علمی مسلمہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، وہ یقیناً علمی مسلمہ ہی ہوگی۔ اس لیے وہ اسلام کی فتح مندی اس میں سمجھتے ہیں کہ ان مسلمہ تصورات کو قرآن وحدیث سے ثابت کر دکھائیں، یہ اسلام اور غیر اسلام میں مطابقت پیدا کرنے کا وہی انداز ہے، جو مغلوب تہذیبیں اپنی غالب تہذیب کے مقابلے میں عموماً اختیار کیا کرتیں ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو طرز فکر اس طرح کی دنیا کے سامنے آئے وہ تہذیب کے جامے میں پیوند بن کر تو رہ سکتا ہے مگر وہ خود تہذیب کا جامہ نہیں بن سکتا، اسی طرح کے تطبیقی بیانات سے اگر کوئی یہ امید رکھتا ہے کہ وہ دنیا کی علمی فضا کو بدل دے گا یا لوگوں کو ناحق سے پھیر کر حق کی طرف لانے میں کامیاب ہوگا تو یہ محض اس کی خوش خیالی ہے، افکار میں تبدیلی کے لیے انقلابی لٹریچر کی ضرورت ہے نہ کہ تطبیقی لٹریچر کی۔

یہ صورحال اس وقت اور زیادہ خرابی کا باعث بنتی ہے، جب کسی بنیادی اور ہمہ جہتی تصور کے بارے میں اس کا اظہار ہوا ہو، ''شہاب ثاقب'' کے بارے میں اگر جدید علمائے فلکیات کی کوئی مختلف تحقیق ہو، اور اس کو مان کر آپ قرآن میں تاویل کریں تو اس سے کسی بڑی خرابی کا اندیشہ نہیں ہے، لیکن اگر کسی ایسے تصور کو قبول کرلیا جائے، جو محض ایک جزوی اور منفرد نوعیت کی چیز نہ ہو بلکہ دیگر سوالات سے بھی اس کا براہ راست تعلق ہو تو سارا فلسفہء دین اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

اس کی واضح مثال ہماری صف کے وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، جنھوں نے نظریہ ارتقاء کو اس بنا پر قبول کرلیا ہے کہ جدید علماء کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے مطالعہ اور تجربے سے اس کی صداقت پر مطمئن ہو چکے ہیں، اس نظریے کو مان لینے کی وجہ سے ان کو اسلام کی ایک ارتقائی تعبیر کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے، اور اسلام کے جامے ارتقاء کی ساخت کے مطابق بنانے کے لیے انھیں پورے کپڑے کو از سر نو ترا شنا پڑا

ہے، مثال کے طور پر ''ارتقا'' کا نقطۂ نظر یہ چاہتا ہے کہ انسان بہ حیثیت نوع مسلسل ترقی کر رہا ہو، اور زندگی کے انجام پر سب کو اعلیٰ مقام حاصل ہو، اس طرز فکر کے مطابق ناپسندیدہ صورحال کو ماضی میں ہونا چاہیے نا کہ مستقبل میں، اس طرح ارتقاء کے فلسفے م، میں جنت کی زندگی تو مناسب معلوم ہوتی ہے، مگر دوزخی زندگی کی تشریح نہیں ہوتی، اس دشواری کو حل کرنے کے لیے ارتقاء پسند ذہن کو یہ کہنا پڑا کہ جہنم سزا کی جگہ نہیں، بلکہ تربیت حاصل کرنے کی جگہ ہے زندگی ہمیشہ رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد کر کے آگے بڑھتی ہے، جو لوگ دنیا میں گناہ کی رکاوٹوں میں گھر کر رہ گئے اور آگے نہ بڑھ سکے، ان کو جہنم کے مشکل حالات میں ڈالنے کا مقصد دراصل ان کی ارتقائی جدوجہد کو اگلی دنیا میں جاری رکھنا ہے، اسی ''مشکل جدوجہد'' کا نام دوزخ ہے، اسی طرح یہ ذہن شخصی ملکیت کے قوانین کو عبوری دور کے احکام قرار دیتا ہے، کیونکہ سماجی ارتقاء کے تصور کے ساتھ ان احکام کا جوڑ نہیں لگتا۔

یہ دو مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے دی گئی ہیں کہ جدید چیلنج کے جواب میں جو کام ہوا ہے، اس کی اہمیت کے باوجود اس میں کس طرح کے نقائص باقی رہ گئے ہیں، مصنف کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس کی کوشش تمام نقائص سے پاک ہے، البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کمی کا یہی احساس اس کوشش کا محرک ہوا۔

کتاب میں جس پہلو سے مذہب کی مدافعت ہے یا جس ذہن کے پیش نظر اس کو مدلل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے دو الگ الگ انداز ہو سکتے ہیں، ایک تصوراتی اور دوسرے تجرباتی، یا دوسرے لفظوں میں ایک فلسفیانہ اور دوسرے سائنٹفک کہا جا سکتا ہو) زیر نظر کتاب میں زیادہ تر دوسرے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس کی خاص وجہ مصنف کا یہ احساس ہے کہ پہلے طرز پر ہمارے یہاں کافی کام ہو چکا ہے، اور اس میں بہت کچھ مواد ہمارے قدیم و جدید لٹریچر میں موجود ہے، جب کہ دوسرے پہلو سے نسبتاً بہت کم کام ہوا ہے، خاص طور پر جدید سائنسی تحقیقات نے

مذہب کے تجرباتی اثبات کے لیے جو وسیع میدان فراہم کر دیا، وہ تو مجھے بالکل ''سیر کیم ایاتہ فتعرفونھا'' (نمل ۹۳) کا مصداق معلوم ہوتا ہے، موجودہ کتاب، ایک لحاظ سے، اسی نئے پیدا شدہ امکان کو منظم طور پر استعمال کرنے کی ایک کوشش ہے۔

تصنیفات کی جدید تقسیم کے مطابق زیر نظر کتاب معروضی مطالعہ (objective study.) کی مثال پیش نہیں کرتی، بلکہ وہ موضوعی یا داخلی (subjective.) انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ جدید ذہن کے نزدیک گویا کتاب کے خلاف خود کتاب کا ووٹ ہے، کیوں کہ جو مطالعہ جانبدارانہ ذہن کے تحت کیا گیا ہو، اس کی صداقت کا یقین کیسے کیا جا سکتا ہے، اس کے جواب میں، میں آسٹرین نو مسلم علامہ اسد کا فقرہ نقل کروں گا، انھوں نے اپنی کتاب کے اسی انداز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اس کتاب میں مصنوعی طور پر غیر جانبدارانہ سروے کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کا انداز ایک مقدمہ جیسا ہے۔۔۔ اسلام کا مقدمہ مغربی تہذیب کے نام۔

اس نفسیاتی بحث سے قطع نظر کہ غیر جانبدرانہ سروے کسی انسان کے لیے ممکن ہے یا نہیں، میں اس بات کو اصولاً تسلیم کرتا ہوں کہ مصنف کو بذات خود کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے غیر جانبدرانہ سروے کا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے اور بلا شبہ ہر دیانتدار مصنف یہی کرتا ہی مگر اس کے بعد جب وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو کتاب میں وہ متلاشی حق نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے پہلے اپنی بے لاگ تلاش وجستجو کے نتیجہ میں وہ جس نقطۂ نظر تک پہونچ چکا ہے، اس کو پیش کرنا چاہتا ہے، اس اعتبار سے اگر چہ ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصنف اپنی سابقہ سرگزشت کو اپنی کتاب میں دہرادے مگر اس قسم کی ایک تصنیف کو غیر جانبدارانہ سروے قرار دینا کم از کم تصنیف کی حد تک علمی تقیہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ کوئی بھی شخص کتاب میں سروے کرنے نہیں

بیٹھتا، بلکہ اپنے سروے کے نتائج کو پیش کرنے کے لیے کتاب لکھتا ہے، گویا کسی کتاب کا معروضی یا موضوعی مطالعہ محض انداز ترتیب کا فرق ہے، نہ یہ کہ ایک غیر جانبدارانہ سروے ہے، اور دوسرا جانبدارانہ مدافعت۔

کتاب میں اکثر ''مذہب'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے یہ کتاب چونکہ ایک عمومی موضوع پر ہے، اس لیے اس کی مناسبت سے عمومی لفظ زیادہ موزوں تھا، مصنف کا ذہن اس بارے میں بالکل صاف ہے کہ مذہب سے مراد کوئی موہوم چیز نہیں بلکہ صرف وہ ہے، جو آج مذہب کی حیثیت سے خدا کے یہاں مسلم ہے۔۔یعنی اسلام۔۔۔اگر ہندوستان کے کسی شہری سے کہا جائے کہ تمھیں قانون کی پیروی کرنی ہوگی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی بھی مجموعہ الفاظ جس پر قانون یا قانون ہند کا اطلاق ہوسکتا ہو بس اس کی پیروی کر لینا کافی ہے، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ قانون جو آج ہندوستانی باشندوں کے لیے قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو ماننا اور اس کی تعمیل کرنا، اسی طرح آج عملی طور پر مذہب سے مراد صرف اسلام ہے، اگر چہ لغت کے اعتبار سے اس کا اطلاق ہر چیز پر ہوتا ہے جو مذہب کے نام سے مشہور ہو، دوسرے لفظوں میں تاریخی فہرست بندی کے طور پر خواہ جس جس چیز کو مذہب شمار کیا جائے، مگر خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آج جو مستند مذہب ہے، وہ صرف اسلام ہے، اور اسلام ہی کی پیروی میں آخرت کی نجات ہے، اس کو سوا نجات کے کوئی صورت نہیں۔

یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین میں ایک مرتبہ مقالہ پڑھنے کے بعد مجھے ایک سوال سے سابقہ پیش آیا، میں نے اپنے مضمون میں فرائڈ کا ایک اقتباس دیا تھا، نفسیات کے ایک پروفیسر بھی اتفاق سے مجلس میں موجود تھے، انہوں نے مقالہ سننے کے بعد کہا، کہ آپ نے فرائڈ کا حوالہ ایک مذہبی بحث میں بطور تائید نقل کیا ہے، حالانکہ فرائڈ وہ شخص ہے ہے، جو سرے سے اس مذہبی نقطۂ نظر ہی کے خلاف ہے، جس کے

آپ نمائندہ ہیں۔

یہی سوال موجودہ کتاب کے بارے میں زیادہ بڑے پیمانے پر کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس میں ایسے بہت سے اقتباسات تائید کے طور پر نقل کئے گئے ہیں جس کے مصنفین کتاب کے اصل مدعا سے اتفاق نہیں کر سکتے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو 'دلیل آخرت'' کا آخری اقتباس) مگر یہ اعتراض درست نہیں، کیوں کہ ان اقتباسات کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ ایک شخص کی ذاتی سند کے طور پر نقل کئے گئے ہیں، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ چونکہ فلاں شخص نے اس کی تصدیق کی ہے، اس لیے وہ بات صحیح ہے، بلکہ تمام اقتباسات کسی علمی دلیل کی وضاحت میں نقل کئے گئے ہیں، مصنف نے ایک دلیل کو پیش کرتے ہوئے کہیں اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، اور کہیں دوسرے کے الفاظ میں۔

ان اقتباسات میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ عموماً وہ ہیں جو کسی کی ذاتی فکر سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ وہ علمی دریافتیں ہیں، ملحدین نے ان علمی دریافتوں کو لے کر ان کو دوسرے دوسرے معنی پہنائے ہیں، اور ہم نے ان کو مذہب کے حق میں پا کر انھیں کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

جو اقتباسات صراحۃً مذہب کی حمایت میں ہیں، وہ عموماً عیسائی علماء کے اقوال ہیں اور آسمانی مذہب پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے ان کے اس طرح کے اقوال میں ہمارے لئے اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، زیر نظر کتاب کا موضوع جدید مادی فکر کے مقابلے میں مذہب کا اثبات ہے اس اثبات کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مذہب ایک غیر مادی چیز ہے، اس لیے وہ مادی علوم کی دسترس سے باہر ہے، ایسی حالت میں مادی علوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کی صداقت پر معترض ہوں، اثبات کا یہ انداز اہل مذاہب کی طرف سے کثرت سے استعمال کیا گیا ہے، پھر

بیسویں صدی میں اس استدلال میں مزید قوت سائنس کے اس اعتراف سے پیدا ہوگئی ہے کہ:۔

''سائنس حقیقت کا صرف جزوی علم دیتی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ خود مادی علوم کے اپنے اعتراف کے مطابق کچھ ایسے حقائق ہو سکتے ہیں جو مادی تحقیقات کے دائرے سے باہر ہوں، اس جدید امکان پر غالباً سب سے زیادہ کامیاب تصنیف جے، ڈبلو، این سولیون کی ہے جس کا کچھ حصہ آٹھویں باب کی تیسری بحث میں ملے گا۔

مادی فکر کے مقابلے میں مذہب کے اثبات کی دوسری صورت یہ ہے کہ خود انھیں ذرائع علم کے تحت اس کو ثابت کیا جائے جس کے مطابق مادی علوم میں کسی چیز کو ثابت کیا جاتا ہے، زیرنظر کتاب میں زیادہ تر اسی دوسری صورت کو سادہ انداز میں اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مصنف کی کوشش یہ ہے کہ مادی حقائق کو ثابت کرنے کے لیے موجودہ زمانے میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اسی کو عام فہم انداز میں مذہب کے اثبات کے لیے استعمال کیا جائے۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، یہ انداز جس کے تحت اس کتاب میں دین کی حمایت ومدافعت کی گئی ہے، ممکن ہے اہل دین میں سے بعض ذہنوں کو اجنبی یا نامناسب معلوم ہو، اگر ایسا ہو تو میں کہوں گا کہ اس کتاب کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک متکلمانہ ضرورت کے طور پر لکھی گئی ہے، نا کہ دین کے طور پر، دین کے مجرد تعبیر وتشریح جو مومن ومسلم طبیعتوں کو سامنے رکھ کر کی جائے اس کا انداز دوسرا ہوتا ہے، لیکن جب سامنے ایسے لوگ ہوں جو ایمان واسلام کو محض اس قسم کا فریب سمجھتے ہوں اور جب دین ومذہب کے خلاف اٹھائے ہوئے سوالات کا مقابلہ کرنا ہو تو قدرتی طور پر بات کا انداز بدل جاتا ہے، ایسی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے کہ معاند کے ذہن کو پیش نظر رکھ کر بات کہی جائے اور اس کی اپنی

زبان اور اصطلاحات میں کلام کیا جائے جب کہ مومن و مسلم کا معاملہ ہوتو گفتگو اپنی فطری شکل میں باقی رہتی ہے اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ موجودہ دور، میں فکر اور استدلال کا اندازہ بالکل بدل گیا ہے، اس لیے موجودہ دور کا علم کلام بھی پہلے کے مقابلے میں بہت کچھ مختلف ہوگا، اگر یہ بات ذہن میں ہوتو کتاب کے مباحث کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوسکتی۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس کتاب کے ساتھ دو ایسی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں، جو پچھلی چوتھائی صدی سے ہندو پاک میں خدمت دین کا نمایاں ترین نشان سمجھے جاتے رہے ہیں، میری مراد مولانا سید ابوالاعلی مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ہے، یہ بالواسطہ طور پر مولانا مودودی ہی کا فیض ہے کہ پندرہ سال پہلے اپنی زندگی کے ایک نازک ترین مرحلے میں میرے دل میں اس احساس نے غلبہ پایا کہ میں اپنی زندگی کو خدمت دین کے لئے وقف کروں جس کا ایک باقاعدہ مظہر یہ کتاب ہے، اور محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اس آغاز کا حسن انجام میں کیوں کہ یہ انھیں کی ذات والا صفات کا فیض ہے، جس کی وجہ سے یہ کام اپنی موجودہ شکل میں تکمیل کو پہنچا۔

فجزاھما اللہ خیر الجزاء۔

لکھنؤ ۲۶ اگست ۱۹۶۴ء وحیدالدین

مخالفین مذہب کا مقدمہ

''جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے، وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (knowledge explosion.) ہے، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں'' یہ جولین ہکسلے کے الفاظ میں علم جدید کا چیلنج ہے، اور ان صفحات میں مجھے اسی چیلنج کا جواب دینا ہے، مصنف کا یقین ہے کہ علم کی روشنی مذہب کی صداقت کو اور زیادہ واضح کرنے میں مددگار ہوئی ہے، اس نے کسی بھی اعتبار سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، دور جدید کی ساری دریافتیں صرف اس بات کا اعتراف ہیں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ آخری صداقت ہے اور آئندہ کی تمام انسانی معلومات اس کی صداقت کو اور مبرہن کرتی چلی جائیں گی، بالکل صحیح تھا۔

سنُریھم ایاتنا فی الافاق و فی انفسھم حتی تبین لھم انہ الحق

ترجمہ: عنقریب ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں ان کو آفاق میں اور خود ان کے اندر یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتا ہے، توجیہہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہنچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے، اسی طرح توجیہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی انتہائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

آگسٹ کامٹے (august comte.) جو انیسویں صدی کے نصف اول جا فرانسیسی مفکر ہے، اس کے نزدیک انسان کی فکری ارتقا کی تاریخ تین مرحلوں میں تقسیم ہے، پہلا مرحلہ الہیاتی مرحلہ (theological stage.) ہے، جب کہ واقعات عالم کی توجیہ خدائی طاقتوں کے حوالے سے کی جاتی ہے، دوسرا مرحلہ مابعد الطبیعیاتی مرحلہ (metaphysical stage.) ہے، جس میں متعین خدا کا نام تو باقی نہیں رہتا پھر بھی واقعات کی توجیہ کے لیے خارجی عناصر کا حوالہ دیا جاتا ہے، تیسرا مرحلہ ثبوتی مرحلہ (positive stage.) ہے جب کہ واقعات کی توجیہ ایسے اسباب کے حوالے سے کی جاتی ہے، جو مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت معلوم ہوتے ہیں، بغیر اس کے کہ کسی روح، خدا یا مطلق طاقتوں کا نام لیا گیا ہو، اس فکر کیرو سے اس وقت ہم اسی تیسرے فکری دور سے گزر رہیہیں، اور اس فکر نے فلسفہ میں جو نام اختیار کیا ہے وہ منطقی ثبوتیت (logical positivism.) ہے۔

منطقی ثبوتیت یا سائنسی تجربیت (scientifc empiricism.) باقاعدہ تحریک کی شکل میں ابھی بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں شروع ہوئی، مگر ایک طرز فکر کی حیثیت سے یہ پہلے ذہنوں میں پیدا ہو چکی تھی، اس کی پشت پر ہیوم (hume) اور مل (mill.) سے لے کر رسل (russel.) تک درجنوں ممتاز مفکرین کے نام ہیں، اور اب ساری دنیا میں اپنے تبلیغی اداروں کے ساتھ وہ موجودہ زمانے کا اہم ترین طریق فکر بن چکا ہے۔

ڈکشنری آف فلاسفی (مطبوعہ نیویارک) میں اس طریق فکر کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے

[every knowledge that is factual is connected with experiences in such away that verification or direct or indirect confirmation is possible. (p.۲۸۵)

یعنی: ہر وہ چیز جو حقیقی ہے، وہ تجربات سے اس طور پر تعلق ہوتا ہے کہ اس کی

جانچ یا براہ راست یا بالواسطہ طریقہ سے اس کی تصدیق حاصل کرنا ممکن ہو، اس طریق مخالفین مذہب کے نزدیک صورحال یہ بنتی ہیکہ ارتقاء کے عمل نے انسان کو آج جس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا ہے، وہ عین اپنے طریق فکر کے اعتبار سے مذہب کی تردید ہے، کیونکہ جدید ارتقاء یافتہ علم نے ہمیں بتایا ہے کہ حقیقت صرف وہی ہوسکتی ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہو، جب کہ مذہب کی بنیاد حقیقت کے ایک ایسے تصور پر ہے جو سرے سے مشاہدے اور تجربے میں آ ہی نہیں سکتی، دوسرے لفظوں میں واقعات وحوادث کی الہیاتی توجیہ ترقی یافتہ ذرائع سے ثابت نہیں ہوتی اس لیے وہ غیر حقیقی ہے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہہ ہے، پہلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا، اس لیے واقعات کی صحیح توجیہہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لئے مگر ارتقاء کے عالم گیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے، اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اٹکل پچو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیا کی حقیقت معلوم کی جائے چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبعی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا، اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کر لی گئی ہے، جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی بلکہ یہ محض دورا علمی کے قیاسات تھے، جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے، جولین ہکسلے لکھتا ہے:۔

''نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو، لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں،

ڈاؤن اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے، اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔''

(religion without revelation,)n.k.1958)p.58.)

یعنی طبعیات نفسیات اور تاریخ، تینوں علوم نیہ ثابت کر دیا ہے کہ جن واقعات کی توجیہہ کے لیے پچھلے انسان نے خدا اور دیوتا کا وجود فرض کر لیا تھا، یا مجرد طاقتوں کو ماننے لگا تھا، اس کے اسباب دوسرے تھے، مگر ناواقفیت کی وجہ سے مذہب کی پر اسرار اصطلاحوں میں بات کرتا رہا۔

ا۔طبعیاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ نا قابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے کچھ قوانین ہیں۔جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں۔بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا، یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے۔ جس کو قانون فطرت (LAW OF NATURE) کا نام دیا گیا۔ اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر تصور ختم ہو جاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی فعال اور قادر خدا ہے جو اس کو چلا رہا ہے، زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہو سکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداء کائنات کو حرکت دی ہو، چنانچہ شروع میں لوگ محرک اول کے طور پر خدا کو مانتے رہے، والیٹر نے کہا کہ خدا نے اس کائنات کا بالکل اسی طرح بنایا ہے جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کر کے انہیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے۔ اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، اس کے بعد ہیوم نے اس'' بے جان اور بے کار خدا'' کو بھی یہ کہہ ختم کر دیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے تو دیکھی ہیں۔لیکن دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں، اس لیے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم خدا

کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا، واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں ہوا وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آ جانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے، مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے، اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے کہ جو سورج کو نکالتا ہے، اور غروب کرتا ہے، اسی طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا، اس کے متعلق یہی کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے مگر اب جب کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت؟، اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (refraction.) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے"۔ بکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے۔

(if events are due to natural causes they are not due to supernatural causes.

یعنی واقعات اگر طفری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

۲۔ اس کے بعد نفسیات کی تحقیق کی گئی تو اس نقطۂ نظر پر مزید یقین حاصل ہو گیا

کیوں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب، انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے نہ کہ فی الواقع کسی خارجی حقیقت کا انکشاف، ایک عالم کے الفاظ میں:

God is nothing but a projection of man on a cosmic screen.

یعنی خدا کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کائناتی سطح پر انسان کی ہستی کا ایک خیالی انعکاس ہے، دوسری دنیا کا عقیدہ، انسان کی اپنی آرزوؤں کی خوب صورت تصویر {beautiful adealisation of human wishes.} سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، وحی و الہام محض بچپن میں دبے ہوئے خیالات کا {childhood repressions.} ایک غیر معمولی اظہار ہیں۔

ان تمام خیالات کی بنیاد نظریہ لاشعور پر قائم ہے، جدید تحقیق سے معلوم ہوا کہ انسان کا ذہن دو بڑے خانوں پر منقسم ہے، ایک خانہ وہ جس کو شعور کہتے ہیں، یہ ہمارے ان افکار کا مرکز ہیں جو عام طور پر ہوش و حواس کی حالت میں شعوری طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرا خانہ لاشعور ہوتا ہے، اس حصہء ذہن کے خیالات عام طور پر ہمارے علم و حافظہ کے سامنے نہیں ہوتے مگر وہ اس کی تہ میں موجود رہتے ہیں، اور غیر معمولی حالات میں یا سوتے وقت خواب میں ظاہر ہوتے ہیں، انسان کے بیشتر خیالات اسی لاشعور کے خانے میں جا کر دفن ہو جاتے ہیں اور اسا عتبار سے ذہن کا شعوری حصہ اس کے لاشعور سے بہت کم ہے، چنانچہ دونوں کا تناسب ظاہر کرنے کے لیے سمندر کے برفانی تودہ iceberg. کی مثال دی جاتی ہے، جس کے نو حصے کئے جائیں تو آٹھ حصے پانی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور صرف ایک حصہ اوپر دیکھنے والوں کو نظر آئے گا (اگرچہ تناسب بھی اضافی ہے)

فرائڈ نے طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا کہ بچپن میں انسان کے لاشعور میں کچھ ایسی چیزیں بیٹھ جاتی ہیں، جو بعد میں غیر عقلی رویے کا باعث بنتی ہیں یہی صورت مذہبی عقائد کی ہے، مثلاً دوسری دنیا اور جنت دوزخ کا تصور دراصل ان

آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہے جو بچپن میں آدمی کے ذہن میں پیدا ہوئیں، مگر حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے پوری نہیں ہوئیں اور دب کر لاشعور میں باقی رہ گئیں، بعد کو لاشعور نے اپنی تسکین کے لیے ایک ایسی دنیا فرض کر لی جہاں وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکے گا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی محبوبہ چیز کو واقعی دنیا میں نہ پا سکا ہو تو وہ نیند کی حالت میں خواب دیکھتا ہے کہ وہ اس سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ اسی طرح بچپن کی بہت سی باتیں جو لاشعور میں تہ نشیں ہو کر بظاہر حافظہ سے نکل گئی تھیں، وہ غیر معمولی حالات مثلاً جنون یا ہسٹریا میں یکا یک زبان پر جاری ہو گئیں تو سمجھ لیا گیا کہ یہ کوئی ماورائی طاقت ہے جو انسان کی زبان سے کلام کر رہی ہے، اسی طرح بڑے اور چھوٹے کے فرق اور complex. father نے خدا اور بندے کا تصور پیدا کیا، اور جو چیز محض ایک سماجی برائی تھی، اس کو کائناتی سطح پر رکھ کر ایک نظریہ گڑھ لیا گیا، لنٹن ralph linton. لکھتا ہے۔

''ایک ایسے قادر مطلق کا تصور جس کے کام خواہ کتنے ہی غیر منصفانہ معلوم ہوں مگر وہ مکمل فرماں برداری اور وفاداری ہی کے ذریعہ خوش کیا جا سکتا ہے، براہ راست سامی عائلی نظام کی پیداوار تھا، اس عائلی نظام نے مبالغہ آمیز مافوق الفطری انانیت کو جنم دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون موسوی کی شکل میں انسانی زندگی اور رویہ کے ہر پہلو کے متعلق محرمات کی ایک مفصل فہرست تیار ہو گئی، محرمات کا یہ سلسلہ ان لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا جو بچپن میں اپنے ماں باپ کے احکام کو یاد رکھنے اور احتیاط سے اس پر عمل کرنے کے عادی ہو چکے تھے، خدا کا تصور مخصوص قسم کے سامی باپ کا پرتو ہے جس کے اختیارات اور اوصاف میں تجرد اور مبالغہ پیدا کر دیا گیا ہے۔''

tree of culture,

۳۔ مذہب کے خلاف مقدمہ کی تیسری بنیاد تاریخ ہے، مخالفین مذہب کا دعویٰ

ہے کہ ہم نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مذہبی تصورات پیدا ہونے کی وجہ وہ مخصوص تاریخی حالات ہیں، جو اس سے پہلے انسان کو گھیرے ہوئے تھے، قدیم زمانے میں سائنس کی دریافتوں سے پہلے سیلاب، طوفا، اور بیماری وغیرہ سے بچنے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ زندگی میں پاتا تھا، اس لیے اس نے اپنی تسکین کے لیے کچھ ایسی غیر معمولی طاقتیں فرض کر لیں جن کو وہ مصیبت کے وقت پکارے اور جن سے وہ دفع بلا کی امید رکھے، اسی طرح سماج کے اندر باہمی پیوستگی پیدا کرنے اور ایک مرکز کے گرد لوگوں کو جوڑ رکھنے کے لیے بھی کسی چیز کی ضرورت تھی، یہ کام اسنے ایسے معبودوں سے لیا جو سارے انسانوں کے اوپر ہوں اور جن کی مرضی حاصل کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہو، وغیرہ وغیرہ، علوم اجتماعی کی انسائیکلو پیڈیا میں مذہب (religon.) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

''جس طرح دوسرے اسباب مذہب کو پیدا کرنے میں اثر انداز ہوئے ہیں، اسی طرح اس میں سیاسی اور تمدنی حالات کا بھی دخل رہا ہے، خداؤں کے نام اور ان کی صفات خود بخود وقت کے نظام سلطنت کی صور میں ڈھل گئے، خدا کو بادشاہ ماننے کا عقیدہ محض انسانی بادشاہیت کی بدلی ہوئی شکل ہے، اور آسمانی بادشاہیت صرف زمینی بادشاہیت کا ایک چربہ ہے، نیز چونکہ بادشاہ سب سے بڑا جج بھی ہوتا تھا، اسی طرح خدا کو بھی عدالت کی کاروائیاں سپرد کر دی گئیں اور یہ عقیدہ بن گیا کہ وہ انسان کی بدی یا نیکی کے بارے میں آخری فیصلہ کرے گا، اس قسم کا عدالتی تصور جو خدا کو محاسب اور مجازی مانتا ہے، اس نے نہ صرف یہودیت میں بلکہ عیسائیت اور اسلام کے مذہبی نقطۂ نظر میں بھی مرکزی مقام حاصل کر لیا ہے۔''

(encyclopaedia of social sciences,(1957)vol.13,p.233)

اس طرح مخصوص تاریخی دور کے حالات اور ان حالات کے انسانی ذہن کے

باہمی تعامل نے وہ تصورات پیدا کئے جن کو مذہب کہا جاتا ہے ''مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے جو عدم واقفیت اور خارجی قوتوں کے مقابلے میں بے سہارا ہونے کی ایک خاص حالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے'' جولین ہکسلے یہ ریمارک دیتا ہوا لکھتا ہے:

religion is the product of a certain type of interaction between man and his environment.
(man in the modern world,p130.)

یعنی مذہب نتیجہ ہے، انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک خاص طرح کے تعامل کا، اب چونکہ وہ مخصوص ماحول ختم ہو گیا ہے، یا کم از کم ختم ہو رہا ہے، جو اس طرح کے تعامل کو وجود میں لانے کا ذمہ دار تھا، اس لیے اب مذہب کو زندہ رکھنے کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، وہ مزید لکھتا ہے:۔

''خدا کا تصور اپنی افادیت کے آخری مقام پر پہنچ گیا ہے، اب وہ مزید ترقی نہیں کر سکتا، مافوق الفطری طاقتیں دراصل مذہب کا بوجھ اٹھانے کے لئے انسانی ذہن نے اختراع کی تھیں، پہلے جادو پیدا ہوا، پھر روحانی تصرفات نے اس کی جگہ لی، پھر دیوتاؤں کا عقیدہ ابھرا اور اس کے بعد ایک خدا کا تصور آیا، اس طرح ارتقائی مراحل سے گزر کر مذہب اپنی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہو چکا ہے کسی وقت یہ خدا ہماری تہذیب کے ضروری مفروضے اور مفید تخیلات تھے، مگر اب جدید ترقی یافتہ سماج میں وہ اپنی ضرورت اور افادیت کھو چکے ہیں۔'' (صفحہ نمبر ۱۳۱)

اشتراکی فلسفہ کے نزدیک بھی مذہب ایک تاریخی فریب ہے، البتہ اشتراکیت چونکہ تاریخ کا مطالعہ تمام تر اقتصادیات کی روشنی میں کرتی ہے، اس لیے اس نے تمام تاریخی اسباب کو سمٹ کر صرف اقتصادی اسباب میں مرکوز کر دیا، اس کے

نزدیک مذہب کو جن تاریخی حالات نے پیدا کیا وہ دور قدیم کا جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام تھا، اب چونکہ یہ فرسودہ نظام اور اپنی موت مر رہا ہے، اس لیے مذہب کو بھی اسی کے ساتھ ختم سمجھنا چاہیے، انگلش کے الفاظ میں ''تمام اخلاقی نظریے، اپنے آخری تجزیے میں وقت کے اقتصادی حالات کی پیداوار ہیں'' انسانی تاریخ طبقاتی لڑائیوں کی تاریخ ہے جس میں سربرآوردہ طبقہ پسماندہ طبقہ کا استحصال کرتا رہا ہے، اور مذہب و اخلاق صرف اس لئے وضع کئے گئے تاکہ سربرآوردہ طبقہ کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے نظریاتی بنیاد حاصل ہو سکے۔

''قانون، اخلاق، مذہب، سب بورژوا کی فریب کاری ہے، جس کی آڑ میں اس کے بہت سے مفادات چھپے ہوئے ہیں''۔ (کمیونسٹ فسٹو)

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگرس (اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں لینن نے کہا تھا:۔

''یقیناً ہم خدا کو نہیں مانتے ہم خوب جانتے ہیں کہ ارباب کلیسا، زمین دار اور بورژوا طبقہ جو خدا کے حوالے سے کلام کرتے ہیں وہ محض استحصال کرنے والے کی حیثیت سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں، ہم ایسے اخلاقی ضابطوں کا انکار کرتے ہیں، جو انسانوں سے ماورا کسی مافوق طاقت سے اخذ کئے گئے ہوں یا طبقاتی تصور پر مبنی نہ ہوں، ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکہ ہے، ایک فریب ہے، زمین داروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لیے مزدوروں اور کسانوں کی فکر پر پردہ ڈالنا (befogging of the minds.) ہے، ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطہ اخلاق تمام تر صرف پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کے تابع ہے، ہمارے اخلاقی اصول کا ماخذ پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کا مفاد ہے۔'' (لینن سلکٹڈ ورکس (ماسکو ۱۹۴۷ء) جلد ۲ ص ۶۶۷)

یہ ہے مخالفین مذہب کا وہ مقدمہ جس کی بنیاد پر دور جدید کے بہت سے لوگ، عضویات کے ایک امریکی پروفیسر کے الفاظ میں کہتے ہیں:۔

science has shown religion to be history,s cruelest and wickedest hoax.

یعنی سائنس نے ثابت کر دیا ہیکہ مذہب تاریخ کا سب سے زیادہ دردناک اور سب سے بدترین ڈھونگ تھا۔

اب ہم اس مقدمہ پر ایک ابتدائی تبصرہ کریں گے۔

فٹ نوٹ:۔

کتاب کا صفحہ نمبر ۱۳ نوٹ نمبر ۱ ہندوستان ٹائمس سنڈے میگزین، ۲۳ ستمبر ۱۹۶۱ء ۲ حم سجدہ۔ ۵۳

کتاب کا صفحہ نمبر ۵ نوٹ نمبر ۱ منطقی ثبوتیت کی تنقید کو دوسری طرح یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ماضی کے علمائے مذاہب کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس نے ایک بیکار چک (dud cheque) لکھ دیا ہو جس کے لیے بنک میں واقعی رقم موجود نہ ہو، یہ لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہے جس کے پیچھے معنویت کا سرمایہ نہیں تھا۔ ''ناقابل تغیر حقیقت اعلیٰ'' قواعد زبان کی رو سے ایک صحیح جملہ ہے، مگر وہ ایک بے کار چک ہے جس کے پیچھے کوئی حقیقی سرمایہ نہیں۔''

(religion and the scientifc out look ,p20.)

کتاب کا صفحہ نمبر ۱۸ کا نوٹ فٹ نمبر ۱:

aqbal review ,,april 1962

کتاب کا صفحہ نمبر ۲۲ کا فٹ نوٹ انمبر:۔

antzs dulring (moscow 1954)p.31.

تبصرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے ان مخالف مذہب استدلالات کا ذکر کیا ہے، جو اس بات کے ثبوت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ دور جدید نے مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک بنیاد دعویٰ ہے، جدید فکر نے مذہب کو کسی بھی درجہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، اگلے ابواب میں ہم مذہب کے بنیادی تصورات کو ایک ایک کر کے کرلیں گے اور دکھائیں گے کہ کس طرح مذہب آج بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے، جیسے کہ وہ پہلے تھا، یہاں گذشتہ دلائل پر ایک عمومی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس دلیل کو لیجئے جو طبیعاتی تق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں، وہ ایک متعین قانون فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اس لئے ان کی توجیہہ کرنے کے لئے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لئے موجود ہیں، اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا، اس نے کہا:۔

nature is a fact an explanation .

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے، تمھارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لئے ہیں، مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہی ہو وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے، جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا، مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں، جب کہ تمھاری دریافت صرف اس مسلمہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے، اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے، جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہہ،

سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیا ہے'' یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیوں ہے'' جب کہ تو جیہہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے، اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے، یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا وہ باہر نکل آئے، پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ ''خدا ایسا کرتا ہے'' مگر اب خوردبینی مشاہدے کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینگ ظہری ہوتی ہے، اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے، سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریئے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے، کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں، جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں، مگر یہ مغالطہ اس کے سوا اور کچھ نہیں، جدید مشاہدے نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے، وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا، اس مشاہدے کے بعد صورحال میں جو فرق ہوا ہے، وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ ''سینگ'' کے اوپر جا کر ٹھہر گیا، بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے، واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی، دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگائیں، جو بچہ کی اس وقت کی ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے

کے لیے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے، اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے گویا پہلے یہ سوال تھا کہ ''خول کیسے ٹوٹتا ہے'' اور اب سوال یہ ہو گیا کہ ''سینگ کیسے بنتی ہے'' ظاہر ہے دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں، اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں، حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات (cecil boyce hamann.) کے الفاظ نقل کروں گا۔

> ''غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی، آخر وہ کون طاقت ہے، جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں، غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب خود کار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے، کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا، حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدے کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا ہے، جس کی تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔''

(the evidence of god in an expanding universe.p.221)

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے، اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں، جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے، اور جس

کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے، مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے، مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے، جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے، مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں ہیں، سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے، وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں، اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کئے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکہ ہے، یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے، یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے، یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا۔

Nature does not explain she is herselelf in need of an explanation.

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لئے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے، تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے چھوٹے سرخ اجزاء ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

''درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں۔''

''ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیمو گلوبن (hemoglobin.) ہے، یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے۔''

''وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے مگر مجھے بتایئے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کل کے اندر باہم مربوط ہیں، اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں۔''

''یہ قدرت کا قانون ہے۔''

''وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانون قدرت کہتے ہیں۔''

''اس سے مراد (blind interplay of physical and chemical forces.)

طبعی طاقتوں کا اندھا عمل۔''

''مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں، جو انھیں متعین انجام کی طرف لے جائے، کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔''

''میرے دوست مجھ سے یہ نہ پوچھو، سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کیا ہے، اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔''

یہ سوال جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے، بلا شبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں ہیں، مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں، اس قسم کی دریافتیں اگر موجود مقدار کے مقابلے میں اربوں کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی، کیونکہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو

رہے ہیں اوران کا آخری سبب کیا ہے، اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے، یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں جب کہ مذہب کی جگہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کرلے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ چل رہی ہے، اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح سے چل رہا ہے، اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے یہاں تک ہوسکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں، مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا، کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے، اور اپنے آپ چلی جارہی ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا، اور اپنے آپ چلا جارہا ہے، ہیریز (a. harris.) نے یہی بات کہی تھی، جب اس نے ڈاروزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

natural selection may explain the survival of the fittest, but cannot explain the arrivl of the fittest. (Revolt against reason by a. lunn. p. 133)

یعنی انتخابی طبیعی کے قانون کے حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر کے باقی رہنے کی توجیہہ کرتا ہے، وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

۲۔ اب نفسیاتی استدلال کو لیجئے کہا جاتا ہے کہ خدا اور دوسری دنیا کا تصور کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی شخصیت اور انسانی آرزوں کو کائناتی سطح پر قیاس کرنا ہے، لیکن میرے لئے ناقابل تصور ہے کہ اس میں استدلال کا پہلو کیا ہے، اس کے جواب میں اگر میں کہوں کہ فی الواقع انسانی شخصیت اور انسانی آرزوئیں کائناتی سطح پر موجود ہیں تو مجھے نہیں معلوم کہ مخالفین کے پاس وہ کون سی حقیقی معلومات ہیں جن کی

بنیاد پر وہ اس کی تردید کر سکیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ جنین کا خوردبینی مادہ چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کی سطح پر ایک شخص کی موجودگی کی پیشین گوئی ہے، نا قابل مشاہدہ ایٹم میں وہ نظام پایا جاتا ہے، جو شمسی نظام کی سطح پر اربوں میل کے دائرے میں گردش کر رہا ہے، پھر وہ شعور جس کا ہم انسان کی صورت میں تجربہ کر رہے ہیں وہ اگر کائناتی سطح پر زیادہ مکمل حالت میں موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اسی طرح ہمارا ضمیر اور ہماری فطرت جس ارتقایافتہ دنیا کو چاہتے ہیں وہ اگر ایک ایسی دنیا کی بازگشت ہو جو فی الواقع کائنات کے پردہ میں موجود ہے تو اس میں آخر استحالہ کا کیا پہلو ہے۔

الف۔ علمائے نفسیات کا یہ کہنا بجائے خود صحیح ہے کہ بچپن میں بعض اوقات ایسی باتیں ذہن میں پڑ جاتی ہیں جو بعد کو غیر معمولی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، مگر اس سے یہ استدلال کرنا کہ انسان کی یہی وہ خصوصیت ہے، جس نے مذہب کو پیدا کیا، بالکل بے بنیاد قیاس ہے، یہاں ایک معمولی واقعہ سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرنا ہے، یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے میں کسی کمہار کو مٹی کی مورت بناتے ہوئے دیکھوں تو پکار اٹھوں کہ یہی وہ شخص ہے، جو ذوی روح انسان کا خالق ہے، کمہار بے شک مٹی کے کھلونوں کا صانع ہے، مگر یہ کہنا کہ اسی طرح کوئی اور کمہار تھا، جس نے خود اس کمہار کو بنایا، ایک مغو بات کے سوا اور کچھ نہیں۔

جدید طرز فکر کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ معمولی واقعہ سے غیر معمولی استدلال کرتا ہے، حالانکہ منطقی اعتبار سے اس استدلال میں کوئی وزن نہیں، اگر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کے تحت کبھی ''غیر معمولی'' باتیں بڑبڑانے لگتا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ انبیاء کی زبان سے کائنات کے جس علم کا انکشاف ہوا ہے، وہ بھی اسی قسم کی ایک بڑبڑاہٹ ہے پہلے واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے اس بات کا ثبوت ہے کہ توجیہہ کرنے

والے کے پاس نبی کے غیر معمولی کلام کو سمجھنے کے لئے کوئی اور میعار موجود نہیں تھا، اس کو ایک ہی بات معلوم تھی۔۔ یہ کہ بعض مرتبہ کوئی شخص خواب یا جنون یا بے ہوشی کی حالت میں کچھ ایسی باتیں زبان سے نکالنے لگتا ہے جو عام طور پر ہوش کی حالت میں کسی کی زبان سے ادا نہیں ہوتیں، اس نے فوراً کہہ دیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جو مذہبی قسم کی باتوں کی ذمہ دار ہے، حالانکہ کسی کے پاس حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی میعار ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بطور واقعہ بھی حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی میعار ہوگا۔

فرض کیجئے دور کے کسی سیارہ سے ایک ایسی مخلوق زمین پر اترتی ہے، جو سنتی تو ہے بولنا نہیں جانتی وہ صرف سماعت کی صفت سے آشنا ہے تکلم کی صفت کی اسے کوئی خبر نہیں ہے، وہ انسان کی گفتگو اور تقریریں سن کر یہ تحقیق شروع کرتی ہے کہ ''آواز'' کیا ہے اور کہاں سے آتی ہے، اس تحقیق کے دوران میں اس کے سامنے یہ نظر آتا ہے کہ درخت کی دو شاخیں جو باہم ملی ہوئی تھیں، اتفاقاً ہوا چلی اور رگڑ سے ان میں آواز نکلنے لگی، پھر جب ہوا رکی تو آواز بند ہوگئی، یہ واقعہ بار بار ان کے سامنے آتا ہے، اب ان میں ایک ماہر ''بغور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ کلام انسانی کا راز معلوم ہوگیا، اصل بات یہ ہے کہ انسان کے منہ میں نیچے اور اوپر کے جبڑوں میں دانت کی موجودگی اس کا سبب ہے، جب یہ نیچے اوپر کے دانت باہر رگڑ کھاتے ہیں تو ان سے آواز نکلتی ہے اور اسی کو کلام کہا جاتا ہے۔۔ دو چیزوں کی رگڑ سے ایک قسم کی آواز پیدا ہونا بجائے خود ایک واقعہ ہے، مگر اس واقعہ سے کلام انسانی کی تشریح کرنا جس طرح صحیح نہیں ہے، اسی طرح غیر معمولی حالات میں لاشعور سے نکلی ہوئی باتوں سے کلام نبوت کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔

ب۔ لاشعور میں جو خیالات دبا دیئے جاتے ہیں وہ اکثر اوقات ایسی ناپسندیدہ خواہشیں ہوتی ہیں، جو خاندان اور سماج کے خوف سے پوری نہیں ہوسکیں،

مثلاً کسی کے اندر اپنی بہن یا لڑکی کے ساتھ جنسی جذبہ پیدا ہوتو وہ اس خیال سے اسے دبا دیتا ہے کہ اس کا ظاہر کرنا رسوائی کا باعث ہوگا، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاید اس کے ساتھ شادی کرنا پسند کرتا، کسی کو قتل کرنے کا خیال ہوتو آدمی اس کو اس ڈر سے اپنے ذہن میں دفن کر دیتا ہے کہ اس کو جیل جانا پڑے گا، وغیرہ وغیرہ، گویا لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں اکثر اوقات وہ برائیاں ہوتی ہیں، جو ماحول کے خوف سے بروئیکار نہ آ سکیں، اب اگر ایسے کسی شخص میں ذہنی اختلال (mental disorder.) پیدا ہوا اور اس کا لاشعور ظاہر ہونا شروع کرے تو اس سے ظاہر ہوگا، ظاہر ہے کہ وہی برے جذبات اور غلط خواہشیں اس کی زبان سے نکلیں گی جو اس کے لاشعور میں بھری ہوئی تھیں، وہ شر کا پیغمبر ہوگا، غیر کا پیغمبر نہیں ہوسکتا، اس کے برعکس انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا ظہور ہوا ہے، وہ سرتا پا غیر اور پاکیزگی ہے، ان کا کلام اور ان کے خیالات میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہی سماج جس کے خوف سے انھوں نے کبھی اپنے یہ خیالات اپنے ذہن میں چھپا لئے تھے، وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہوجاتا ہے،، اور صدیوں پر صدیاں گزر جاتی ہیں، پھر بھی انھیں نہیں چھوڑتا،۔

ج ۔نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کا لاشعور اصلاً خلا (vacuum.) ہے، اس میں پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی بلکہ شعور کی راہ سے گزر کر پہنچتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ لاشعور صرف انھیں واردات اور معلومات کا گدام ہے جو، کبھی انسان کے علم میں آیا ہو، وہ نامعلوم حقائق کا خزانہ نہیں بن سکتا، لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا اعلان ہوا ہے،، وہ ایسی حقیقتوں پر مشتمل، جو وقتی نہیں، دائمی ہیں، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہ تو انھیں پہلے سے معلوم تھیں نہ ان کے وقت تک پوری نسل انسانی کو معلوم ہوسکی تھیں، اگر ان حقائق کا سرچشمہ لاشعور ہوتا تو وہ ہرگز ایسا معلوم حقائق کا ظہار نہیں کرسکتا تھا۔

انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا اظہار ہوا ہے اس میں طبعیات، حیاتیات، نفسیات، تاریخ تمدن، سیاست، معاشرت، غرض سارے ہی علوم کسی نہ کسی اعتبار سے مس ہوتے ہیں، ایسا ہمہ گیر کلام لاشعور تو درکنار شعور کے تحت بھی اب تک کسی انسان سے ظاہر نہیں ہوا جس میں غلط فیصلے، خام اندازے اغلاط سے بالکل پاک ہے، وہ اپنی دعوت، اپنے استدلال اور اپنے فیصلوں میں تمام انسانی علوم کو چھوتا ہے، مگر سینکڑوں، ہزاروں برس گزر جاتے ہیں، اگلی نسلوں کی تحقیق کی تحقیق پچھلی نسلوں کے خیالات کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیتی ہے، مگر مذہب کی صداقت پھر بھی باقی رہتی ہے، آج تک حقیقی معنوں میں اس کے اندر کسی غلطی کی نشان دہی نہ ہو سکی اگر کسی نے ایسی جرات کی ہے تو وہ خود غلط کار ثابت ہوا ہے۔

یہاں میں ایک تازہ مطبوعہ مثال دیتا ہوں جس میں ایک ماہر نفسیات نے انتہائی یقین کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس نے قرآن میں ایک فنی غلطی ڈھونڈ نکالی ہے، جیمز ہنری بریسٹڈ (james hanry brested.)

مغربی ایشیا کی قوموں میں طویل مدت کے رواج اور خاص طور پر اسلام کے غلبہ نے قمری کیلنڈر کو دنیا بھر میں رائج کر دیا قمری اور شمسی سال کے درمیان فرق کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس انتہائی لغو حد تک لے گئے کہ تصور کیا جا سکتا ہے، وہ کیلنڈر کے مسائل کی نوعیت سے اتنا زیادہ بے خبر تھے کہ قرآن میں باضابطہ انھوں نے کبیسہ کے مہینے (intercalary months.) کا ٹھہرانا ممنوع قرار دے دیا، ۳۵۴ دنوں کا نام نہاد قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنی گردش میں ہر ۳۳ سال میں ایک سال اور ہر صدی میں تین سال زیادہ ہو جاتا ہے، ایک ماہانہ مذہبی عمل جیسے رمضان اگر اس وقت جون میں ہو تو چھ (۶) سال بعد اپریل میں آئے گا (۱۹۳۵ء) میں ہجرت کو ۱۳۱۳ سال گزر چکے ہیں، جب سے کہ ہجری سال شروع ہوا، مگر ہماری ایک صدی مسلمانوں کے قمری سال کے اعتبار سے ایک سو تین

سال سے زیادہ کی ہوتی ہے، ہمارے عام شمسی سالوں کے اعتبار سے جب ۱۳۱۳ سال ہوتے ہیں تو مسلم سال کے اعتبار سے تقریباً اکتالیس (۴۱) سال زیادہ ہو چکے ہوتے ہیں،، اس طرح مسلمانوں کا سال ہجری وقت تحریر ۱۳۵۴ تک پہنچ چکا ہے، یعنی شمسی اعتبار سے ۱۳۱۳ سالوں میں ۴۱ سال مزید مشرقی ملکوں کے یہودی چرچ نے اس قسم کی لغویت (absurdity.) کو ختم کر کے لوند یا مہنوں کے اضافہ کا طریقہ (intercalation.) کو اختیار کیا اور اس طرح قمری کیلنڈر کو شمسی سال کے ڈھانچہ کے مطابق بنالیا، اس بنا پر تمام ایشیا اب تک اس انتہائی قدیم طریقے۔۔ قمری کیلنڈر کی زحمت کو برداشت کر رہا ہے۔''

(time and its mysteries(n.y.1962)p.sg.)

یہاں مجھے قمری اور شمسی کیلنڈر کے فرق پر کوئی بحث نہیں کرنی، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مصنف نے جس واقعہ کو پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کر کے ''انتہائی لغو بے خبری'' کا الزام لگایا ہے، وہ واقعہ بذات خود صحیح نہیں، قرآن میں جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے، وہ کبیسہ کے مہینے ٹھہرانا نہیں بلکہ ''نسئی'' ہے، (توبہ۔۳۷) نسئی کے معنی عربی زبان میں تاخیر کے ہیں، یعنی موخر کرنا، مثلاً حوض پر ایک جانور پانی پی رہا ہے، اور آپ نے اس کو ہٹا کر اپنے جانور کو حوض پر کھڑا کر دیا کہ پہلے آپ کا جانور پانی پی لے، اس کے بعد دوسرا پئے، تو اس طرح ہٹانے کو کہیں گے، ''نسا الدابۃ''

حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے ذریعہ عرب میں جو طریقے رائج ہوئی تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ''اشہر حرم'' (خاص ادب و احترام کے مہینے) ہیں، یہ مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ محرم اور رجب تھے، ان میں خون ریزی اور جدال و قتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا، لوگ حج و عمرہ اور کاروبار کے لئے امن و امان کے ساتھ آزادنہ سفر کر سکتے تھے، بعد کو جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس قانون کی پابندی سے بچنے کیلئے نسئی کی اسم نکالی، یعنی جب

کسی زور آور قبیلہ کی خواہش ماہ محرم میں جنگ کرنے کی ہوئی تو ایک سردار نے اعلان کردیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہر حُرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کردیا، دوسرے لفظوں میں محرم کو اپنی جگہ سے ہٹا کر صفر کی جگہ رکھ دیا، یہی محترم مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کی رسم تھی جس کو نسئی کہا جاتا تھا، اور اسی کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ ''زیادۃ فی الکفر'' ہے۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ عربوں میں ''لوند'' کیبھی ایک قسم کا رواج تھا یعنی مہینوں کا عدد بدل دیتے تھے، مثلاً بارہ مہینے کے چودہ مہینے بنا لئے، مگر ایک مفسر قرآن کے الفاظ میں:۔

''بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کیلئے لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں، وہ نسئی میں داخل نہیں۔''

معلوم ہوا کہ دور بے خبری میں بھی پیغمبر خدا نے بے خبری کی بات نہیں کہی، حالانکہ اگر ان کے الفاظ محض شعوری یا لاشعور سے نکلتے ہوتے تو اس قسم کی بے خبری کا ظاہر ہونا لازمی تھا (اگلے ابواب میں تفصیلی مثالیں آ رہی ہیں۔)

۳۔ تاریخ یا سماجی مطالعہ کے حوالے سے استدلال کرنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ صحیح رخ سے مذہب کا مطالعہ نہیں کرتے، اس لئے پورا مذہب ان کو اصل حقیقت کے خلاف ایک اور ہی شکل میں نظر آنے لگتا ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چوکور چیز کو کوئی شخص ترچھا کھڑا ہو کر دیکھے ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو وہی چیز جو حقیقۃً چوکور ہے، تکونی نظر آ سکتی ہے۔

ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہب کا مطالعہ ایک مفروضی مسئلہ (objective problem.) کے طور پر کرتے ہیں، یعنی ظاہری طور پر مذہن کے نام سے جو تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے، ان سب کو مذہب کے اجزاء سمجھ کر یکساں حیثیت سے جمع کر کینا اور پھر ان کی روشنی میں مذہب کے بارے میں ایک

رائے قائم کرنا، اس کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر ان کی پوزیشن غلط ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب ان کی نظروں میں محض ایک سماجی عمل بن جاتا ہے، نہ کہ کوئی انکشاف حقیقت، ایک چیز جو انکشاف حقیقت کی نوعیت رکھتی ہو، وہ بذات خود ایک آئیڈیل ہوتی ہے، اور اس کے اپنے آئیڈیل کی روشنی میں اس کے مظاہر اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہو، اس کی حیثیت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے، جب تک سماج نے بالفعل کو یہ حیثیت دے رکھی ہو، اگر سماج اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی اور طریقہ اختیار کر لے تو پھر وہ ایک تاریخی چیز ہو جاتی ہے اور سماجی روایت کی حیثیت سے اس کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔

مگر مذہب کا معاملہ اس سے مختلف ہے، مذہب کا مطالعہ ہم اس طرح نہیں کر سکتے جس طرح ہم سواری اور لباس اور مکان کا مطالعہ کرتے ہیں، کیوں کہ مذہب اپنی ذات میں ایک حقیقت ہے، جس کو سماج اپنے ارادہ سے قبول کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے تو ناقص شکل میں، اس کی وجہ سے مذہب اپنی اصولی حیثیت میں تو ہمیشہ یکساں رہتا ہے، مگر سماج کے اندر رواج یافتہ ہئیت کے اعتبار سے اس کی شکلیں مختلف ہو جاتی ہیں، اس لئے سماج کے اندر رواج یافتہ مذاہب کی یکساں فہرست بندی کر کے ہم مذہب کو سمجھ نہیں سکتے۔

مثال کے طور پر جمہوریت کو لیجئے جمہوریت ایک مخصوص سیاسی نظام کا نام ہے، اور کسی حکومت کو اس معیار کی روشنی ہی میں جمہوری یا غیر جمہوری کہا جا سکتا ہے یعنی جمہوریت کے اپنے معیار کی رو سے تمام ملکوں کو دیکھا جائے گا، اور اسی رویہ کو جمہوری قرار دیا جائے گا جو حقیقۃً جمہوری ہو، اس کے برعکس اگر جمہوریت کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ہر وہ ملک جس نے اپنے نام کے ساتھ جمہوری، کا لفظ لگا رکھا ہے، اس کو حقیقۃً جمہوری فرض کر کے جمہوریت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر

جمہوریت ایک بے معنی لفظ بن جائے گا کیونکہ ایسی حالت میں امریکہ کی جمہوریت چین کی جمہوریت سے مختلف ہوگی، انگلینڈ کی جمہوریت مصر کی جمہوریت سے ٹکرائے گی، ہندوستان کی جمہوریت کا پاکستان کی جمہوریت سے کوئی جوڑ نہیں ہوگا، اس کے بعد جب ان سارے مشاہدات کو ارتقائی ڈھانچہ میں رکھ کر دیکھا جائے گا تو وہ اور زیادہ بے معنی ہو جائے گا، کیوں کہ فرانس جو جمہوریت کا مقام پیدائش ہے، اس کا مطالعہ بتائے گا کہ جمہوریتا پنے جدید ترین ارتقائی مرحلہ کے مطابق نام ہے، جنرل ڈیگال کی فوجی آمریت کا۔

اس طریق مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کے لئے خدا کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی، مذہب کی ''تاریخ'' میں اس کی مثال موجود ہے کہ مذہب خدا کے بغیر بھی ہوسکتا ہے، یہ مثال بدھ دھرم کی ہے، جو ''مذہب'' ہونے کے باوجود خدا کے تصور سے خالی ہے، اس لئے آج بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہب کا مطالعہ خدا سے الگ کر کے کیا جانا چاہئے، اگر اس ضرورت کو تسلیم کرلیا جائے کہ لوگوں کے اندر اخلاق اور تنظیم پیدا کرنے کے لئے مذہبی نوعیت کی کوئی چیز ضروری ہے تو اس کا مقصد کے لئے لازمی طور پر خدا کو ماننا ضروری نہیں، بے خدا مذہب بھی اس ضرورت کو پورا کرسکتا ہے،، چنانچہ یہ لوگ بدھزم کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ اب موجودہ ترقی یافتہ دور میں اس قسم کا مذہبی ڈھانچہ سماج کے لئے زیادہ موزوں ہے، ان حضرات کے نزدیک دور جدید کا خدا خود سماج اور اس کے سیاسی اور معاشی مقاصد ہیں، اس خدا کا پیغمبر پالیمنٹ ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی مرضی سے انسانوں کو باخبر کرتا ہے، اور اس کی عبادت گاہیں، مسجد اور گرجا نہیں بلکہ ڈیم اور کارخانے ہیں، وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو ہکسلے کی کتاب ''مذہب بغیر الہام'')۔

مذہب کو اقرار خدا سے انکار خدا تک پہنچانے میں نام نہاد ارتقائی مطالعہ کا بھی دخل ہے، یہ حضرات یہ کرتے ہیں کہ پہلے ان تمام چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں جو کبھی

مذہب کے نام سے منسوب رہی ہیں، اور اس کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ان کے درمیان ایک ارتقائی ترتیب قائم کر لیتے ہیں، جس میں ایسے تمام پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے ان کی مزعومہ ارتقائی ترتیب مشتبہ ہو سکتی ہو، مثلاً انسانیات (ontology.) اور سماجیات (sociology.) کے ماہرین نے زبردست مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ ''دریافت'' کیا ہے کہ خدا کا تصور کئی خداؤں سے شروع ہوا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ایک خدا تک پہونچا لیکن یہ ترقی ان کے نزدیک الٹی ہوئی ملکیونکہ خدا کے تصور نے ایک خدا کی شکل اختیار کر کے اپنے آپ کو تضاد میں مبتلا کر لیا ہے، ''کئی خدا'' کا تصور کم از کم اپنے اندر یہ قدر رکھتا تھا کہ مختلف خداؤں کو ماننے والے ایک دوسرے کو تسلیم کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں مگر ''ایک خدا'' کے عقیدے نے قدرتی طور پر تمام دوسرے خداؤں اور ان کو ماننے والوں کو باطل ٹھہرایا اور برتر مذہب (higher religion.) کا تصور پیدا کیا جس کی وجہ سے قوموں اور گروہوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی جنگیں شروع ہو گئیں، اس طرح خدا کے تصور نے غلط سمت میں ارتقا کر کے خود ہی اپنے لئے موت کا سامان مہیا کر دیا ہے، کیوں کہ ارتقاء کا قانون یہی ہے۔ (man in the modern world,pp.112)

مگر اس ارتقائی ترتیب میں صریح طور پر اصل واقعہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیوں کہ معلوم تاریخ کے مطابق سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوح تھے اور ان کی دعوت کے متعلق ثابت ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت تھی، اس کے علاوہ تعداد آلہہ (polytheism.) کا مطلب بھی مطلق تعدد نہیں ہے، کبھی کوئی قوم ان معنوں میں مشرک نہیں رہی ہے کہ بالکل یکساں نوعیت کے کئی خدا مانتی ہو، اس کے برعکس تعدد آلہہ کا مطلب ایک بڑے خدا کو مان کر کچھ اس کے مقربین خاص کا اقرار کرنا ہے، جو ذیلی خداؤں کے طور پر کام کرتے ہیں، شرک کے ساتھ ہمیشہ ''ایک خدائے

خدائگان'' کا تصور پایا جاتا رہا ہے، ایسی حالت میں ''ارتقائی مذہب'' ایک بے دلیل عقیدہ کے سوا اور کیا ہے۔۔۔۔۔

مارکسی نظریہ تاریخ اور زیادہ لغو ہے، یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی دراصل عامل ہیں جو انسان کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں، مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا، اب چونکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے اس لئے اس کے درمیان پیدا ہونے والی اخلاقی و مذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول کا عکس ہوں گے وہ لوٹ کھسوٹ کے نظریات ہوں گے مگر یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن نہیں رکھتا ہے اور نہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ نظریہ انسانی ارادے کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے، اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیداوار قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی نہیں، جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتے ہیں، اسی طرح آدمی بھی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے، وہ الگ سے سوچ کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے، اسی کے مطابق سوچنے لگتا ہے، اگر یہ واقعہ ہے تو مارکس، جو خود بھی ''سرمایہ دارانہ نظام'' کے اندر پیدا ہوا تھا، اس کے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے، کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جا کر کیا تھا، مگر مذہب کو پیدا کرنے والی چیز وقت کا اقتصادی نظام ہے تو آخر مارکس بھی وقت کے اقتصادی نظام کی پیداوار کیوں نہیں ہے، مذہب کی جو حیثیت مارکس کو تسلیم نہیں ہے، وہی حیثیت اس کے اپنے لئے کس طرح جائز ہوگی۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے، اس کے پیچھے کوئی بھی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔

تجربہ سے بھی اس نظریئے کی غلطی واضح ہو چکی ہے، روس کی مثال اس کو سمجھنے

کے لئے کافی ہے، جہاں تقریباً آدھی صدی سے اس نظریہ کو مکمل غلبہ حاصل ہے، طویل ترین مدت سے زبردست پروپیگنڈہ ہو رہا ہے، کہ روس کے مادی حالات بدل گئے ہیں، وہاں کا نظام پیداوار، نظام تبادلہ اور نظام تقسیم دولت سب غیر سرمایہ دارانہ ہو چکا ہے، مگر اسٹالن کے مرنے کے بعد خود روسی لیڈروں کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے کہ اسٹالن کے زمانہ حکومت میں روس کے اندر ظلم و جبر کا نظام رائج تھا اور عوام کا اسی طرح استحصال کیا جا رہا تھا، جیسے سرمایہ دارانہ ملکوں میں ہوتا ہے اور اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ روس میں پردیس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہونے کی وجہ سے اسٹالن کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے ظلم اور استحصال کو دنیا کے سامنے عدل و انصاف کے نام سے مشہور کرے، اور پردیس کا یہی کنٹرول اب بھی وہاں جاری ہے، تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ آج بھی خوب صورت پروپیگنڈے کے پس منظر میں روس کے اندر وہی سب کچھ ہو رہا ہے، جو اسٹالن کے زمانے میں ہوتا تھا، روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں (فروری ۱۹۵۶ء) نے اسٹالن کے مظالم کا انکشاف کیا تھا، اس کے بعد اگر پارٹی کی کوئی اور کانگرس خروشچیف کی درندگی کا راز فاش کرے تو اس میں ہرگز اچنبھے کی کوئی بات نہ ہوگی۔ آدھی صدی کے اس تجربے سے جو نتیجہ نکلا ہے، اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ پیداوار اور تبادلہ کی نام نہاد تبدیلی سے انسان نہیں بدل جاتے، اگر انسانی ذہن نظام پیداوار کا تابع ہوتا اور اسی کے مطابق خیالات پیدا ہوا کرتے تو اشتراکی حکومت میں ظلم اور استحصال کی ذہنیت بھی یقینی طور پر ہیدا نہیں ہونی چاہیے تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے خلاف دور جدید کا پورا استدلال ایک قسم کا علمی سفسط (scientific sophism.) ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں اس نام نہاد علمی استدلال کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' یہ صحیح ہے کہ واقعات کے مطالعہ کے لئے ''علمی طریقہ'' اختیار کیا جاتا ہے مگر

علمی طریقہ محض ایک طریقہ ہونے کی وجہ سے صحیح نتائج تک نہیں پہونچا سکتا، اس کے ساتھ دوسرے ضروری پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے مثلاً ادھوری اور ایک رخی معلومات پر اگر علمی طریقہ کو آزمایا جائے تو وہ بظاہر علمی ہونے کے باوجود ناقص اور غلط نتیجے ہی تک پہنچائے گا۔

جنوری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتے میں نئی دہلی میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگرس ہوئی جس میں بارہ سو علمائے مشرقیات شریک ہوئے، اس موقع پر ایک صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس میں کئی مسلم یادگاروں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی بنوائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہندو راجاؤں کی بنوائی ہوئی ہیں، مثلاً قطب مینار جو قطب الدین ایبک کی طرف منسوب ہے، وہ دراصل وشنو دھوج ہے، جس کو اب سے ۲۳ سو سال پہلے سمندر گپت نے بنوایا تھا، بعد میں مسلم مورخین نے اس کو غلط طور پر قطب مینار کے نام سے پیش کیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جو بہت پرانے ہیں اور قطب الدین ایبک سے بہت پہلے تراشے گئے تھے۔

بظاہر یہ ایک علمی استدلال ہے، کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے کچھ پتھر موجود ہیں مگر قطب مینار کے مطالعہ کیلئے صرف اس کے پرانے پتھروں کا حوالہ دینے سے علمی استدلال کا حق ادا نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ اور بہت سے پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہہ قطب مینار پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتی، اس کے بجائے یہ دوسری توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کے پرانے پتھر دراصل پرانی عمارتوں کے کھنڈر سے حاصل کئے گئے جس طرح دوسری قدیم سنگی عمارتوں میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، پھر جب اس دوسری توجیہ کو قطب مینار کی ساخت اس کے نقشہ تعمیر، پرانے پتھروں کا انداز نصب، مینار کے ساتھ ناتمام مسجد اور جوابی مینار کے بقیہ آثار نیز

تاریخی شہادتوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہی دوسری توجیہہ صحیح ہے، اور پہلی توجیہہ ایک مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

مخالفین مذہب کا مقدمہ بھی بالکل ایسا ہی ہے، جس طرح مذکورہ بالا مثال میں چند پتھروں کو ایک خاص رنگ دیکر سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی استدلال حاصل ہو گیا، اسی طرح چند جزی ءاور اکثر اوقات غیر متعلق واقعات کو ناقص رخ سے پیش کر کے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی طریق مطالعہ نے مذہب کی تردید کر دی، حالانکہ واقعہ کے تمام اجزاء کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی صداقت کا یہ بذات خود ایک کافی ثبوت ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد بہترین ذہن بھی الل ٹپ باتیں کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد آدمی کے پاس مسائل پر غور وفکر کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی، مخالفین مذہب کی فہرست میں جو نام ہیں، وہ اکثر نہایت ذہین اور ذی علم افراد ہیں، بہترین دماغ، وقت کے بہترین علوم سے آراستہ ہو کر اس میدان میں اترے ہیں، مگر ان اہل دماغ نے ایسی ایسی مہمل باتیں لکھی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں کو لکھتے وقت آخر دماغ کہاں چلا گیا تھا، یہ سارا لٹریچر بے یقینی، تضاد، اعتراف ناواقفیت اور الل ٹپ استدلال سے بھرا ہوا ہے کھلی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کرنا اور معمولی تنکے کے سہارے دعاوی کے پل کھڑے کرنا، یہ ان کا کل کارنامہ ہے، یہ صورت حال بلا شبہ اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ ان حضرات کا مقدمہ صحیح نہیں، کیوں کہ بیان اور استدلال کی یہ خرابیاں صرف غلط مقدمہ کی خصوصیت ہیں، صحیح مقدمے میں کبھی یہ چیزیں پائی نہیں جا سکتی۔

مذہب کی صداقت اور مخالفین مذہب کے نظریے کی غلطی اس سے بھی واضح ہے کہ مذہب کو مان کر زندگی اور کائنات کا جو نقشہ بنتا ہے، وہ ایک نہایت حسین وجمیل نقشہ ہے، وہ انسان کے اعلیٰ افکار سے اسی طرح مطابق ہے جیسے مادی کائنات

ریاضیاتی میعاروں کے عین مطابق ہے، اس کے برعکس مخالف مذہب فلسفہ کے تحت جو نقشہ بنتا ہے، وہ انسانی ذہن سے بالکل غیر متعلق ہے یہاں برٹرینڈ سل کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

''انسان ایسے اسباب کی پیداوار ہے، جن کا پہلے سے سوچا سمجھا کوئی مقصد نہیں، اس کا آغاز، اس کی نشو ونما، اس کی تمنائیں اور اس کے اندیشے، اس کی محبت اس کے عقائد، سب محض ایٹموں کی ارتقائی ترتیب کا نتیجہ ہیں، اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے، اور اس کے بعد کوئی چیز بھی اسے زندگی عطا نہیں کر سکتی، قرنہا قرن کی جدو جہد، تمام قربانیاں، بہترین احساسات اور عبقریت کے روشن کارنامے سب نظام شمسی کے خاتمے کے ساتھ فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں، انسانی کامرانیوں کا پورا محل ناگزیر طور پر کائنات کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائے گا، یہ باتیں اگر بالکل قطعی نہیں تو وہ حقیقت سے اتنی قریب (so nearly certain.) ہیں کہ جو فلسفہ بھی اس کا انکار کرے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا۔''

یہ اقتباس گویا غیر مذہبی مادی فکر کا خلاصہ ہے، اس کے مطابق ساری زندگی نہ صرف یہکہ بالکل تیرہ وتار نظر آتی ہے، بلکہ اگر زندگی کی مادی تعمیر کو لیا جائے تو پھر خیر وشر کا کوئی قطعی میعار باقی نہیں رہتا، اس کے رو سے انسانوں پر بم گرانا کوئی ظالمانہ فعل نہیں، کیونکہ انسانوں کو بحر حال ایک دن مرنا ہے، اس کے برعکس مذہبی فکر میں امید کی روشنی ہے، اس میں زندگی اور موت دونوں بامعنی نظر آنے لگتے ہیں، اسی میں ہماری نفسیات کے تمام تقاضے اپنی جگہ پا لیتے ہیں، ایک تصور کے ریاضیاتی ڈھانچے میں فٹ ہو جانے کے بعد اگر سائنس دان مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے حقیقت پالی تو مذہبی تصور کا انسانی ذہن میں پوری طرح بیٹھ جانا یقینی طور پر اس بات

کا ثبوت ہے کہ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو انسان کی فطرت تلاش کر رہی تھی، اس کے بعد ہمارے پاس اس کے انکار کے لئے کوئی واقعی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

یہاں میں ایک امریکی ریاضی داں (earl chester rex.) کے الفاظ نقل کروں گا۔

''میں سائنس کے اس تسلیم شدہ اصول کو استعمال کرتا ہوں جو دو یا زیادہ مختلف نظریوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، اس اصول کے مطابق اس نظریے کو اختیار کرلیا جاتا ہے، جو مقابلتہً نہایتسادگی کے ساتھ تمام متنازعہ فیہ مسائل کی تشریح کر دے، بہت عرصہ ہوا جب یہی اصول ٹولوی کے نظریے (ptolemaic theroy.) اور کوپرنیکس کے نظریے کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا، اول الذکر کا دعویٰ تھا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز ہے، اس کے برعکس ثانی الذکر کہتا تھا کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے، ٹولومی کا نظریہ اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا کہ زمین کی مرکزیت کا نظریہ رد کر دیا گیا''

مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ استدلال بہت سے لوگوں کے لئے کافی نہیں ہوگا، ان کے مادی ذہن کے چوکھٹے میں کسی طرح خدا اور مذہب کی بات نہیں بیٹھے گی، مگر جو چیز مجھے مطمئن کرتی ہے، وہ یہ کہ ان حضرات کا عدم اطمینان حقیقتہً مذہب کے حق میں استدلال کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ ان کا وہ متعصّبانہ ذہن ہے جو مذہبی استدلال کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا جیمز جینز نے اپنی کتاب ''پراسرار کائنات'' کے آخر میں نہایت صحیح لکھا ہے کہ:۔

''ہمارے جدید ذہن واقعات کی مادی توجیہہ کے حق میں ایک طرح کا تعصب (bias.) رکھتے ہیں۔''

وھٹکر چیمبرز (whittaker chambers.) نے اپنی کتاب شہادت (witness.) میں اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو بلا شبہ اس کی زندگی کے لئے ایک نقطۂ انقلاب (turning point.) بن سکتا تھا، وہ اپنی چھوٹی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بچی کے کان پر جا پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کی ساخت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنے جی میں سوچا۔ ''یہ کتنی غیر ممکن بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آ جائے۔ یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشے کے تحت ہی ممکن ہو سکے گی'' مگر اس نے جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا، کیونکہ اسے احساس ہوا کہ اگر اس کو منصوبہ مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے منصوبہ ساز (خدا) کو بھی ماننا ہوگا، اور یہ ایک ایسا تصور تھا، جسے قبول کرنے کے لئے اس کا ذہن آمادہ نہیں تھا۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ٹامس ڈیوڈ پارکس (thomas david parks.) لکھتا ہے۔

''میں اپنے پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلے میں اپنے رفقاء کار میں بہت سے سائنسدانوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور طبیعیات کے مطالعہ و تجربہ کے دوران میں انھیں بھی متعدد مرتبہ اس طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا۔''

(the evidence of god in an expanding uaiverse,
edited by john clover monsma,
n.y.1958.p.73-74)

نظریہ ارتقاء کی صداقت پر موجودہ زمانے کے ''سائنس دان'' متفق ہو چکے ہیں، ارتقائی تصور ایک طرف تمام علمی شعبوں پر چھاتا جا رہا ہے، ہر وہ مسئلہ جس کو سمجھنے کے لئے خدا کی ضرورت تھی، اس کی جگہ بے تکلف ارتقا کا ایک خوب صورت بت بنا کت رکھ دیا گیا ہے، مگر دوسری طرف عضویاتی ارتقاء (organic evolution.) کا نظریہ، جس سے تمام ارتقائی تصورات اخذ کئے گئے ہیں، اب

تک بے دلیل ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس تصور کو ہم صرف اس لئے مانتے ہیں کہ اس کا کوئی بدل ہمارے پاس موجود نہیں ہے، سر آرتھر کیتھ (keith.) نے ۱۹۵۳ء میں کہا تھا۔

evolution is unproved and unprovasle.we believe it only because the only alternative is special creation and that is unthinkable.

(islamic thought, dec. 1961.

ارتقاء ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے، اور وہ ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا ہم اس پر صرف اس لئے یقین کرتے ہیں کہ اس کا واحد تخلیق کا عقیدہ ہے جو سائنسی طور پر نا قابل فہم ہے، گویا سائنس دان ارتقاء کے نظریے کی صداقت پر صرف اس لئے متفق ہو گئے ہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ دیں تو لازمی طور پر انھیں خدا کے تصور پر ایمان لانا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ مادی طرز تعبیر کے حق میں اس قسم کے تعصّبات رکھتے ہوں، وہ انتہائی کھلے ہوئے واقعات سے بھی کوئی سبق نہیں لے سکتے تھے، اور مجھے اعتراف ہے کہ ایسے لوگوں کو مطمئن کرنا میرے بس سے باہر ہے اس تعصب کی بھی ایک خاص وجہ ہے، یہاں میں ایک امریکی عالم طبیعیات (george herbert blount.) کے الفاظ نقل کروں گا۔

''خدا پرستی کی معقولیت اور انکار خدا کا پھسپھسا پن بجائے خود ایک آدمی کے لئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتا، لوگوں کے دل میں یہ شبہ چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ علما جو ذہنی آزادی (intellctual liberty.) کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، آزادی کی محدودیت کا کوئی بھی تصور ان کے لئے وحشت ناک ہے۔''

(the evidence of god ,p.130)

چنانچہ جولین ہکسلے نے نبوت کے تصور کو ناقابل برداشت اظہار برتری" قرار دیا ہے، کیونکہ کسی کو نبی ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ حیثیت دی جائے کہ اس کی بات خدا کی بات ہے، اور اس کو حق ہے کہ وہ جو کچھ کہے تمام لوگ اس کو قبول کر لیں، لیکن جب انسان کی حیثیت یہی ہے کہ وہ خالق نہیں مخلوق ہے، وہ خدا نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہے تو اس صورت واقعہ کو کسی خود ساختہ تصور کی بنا پر ختم نہیں کیا جا سکتا ہم حقیقت کو بدل نہیں سکتے، ہم صرف اس کا اعتراف کرتے ہیں، اب اگر شترمرغ کا انجام ہم اپنے لئے پسند نہیں کرتے تو ہماری بہترین عقل مندی یہ ہے کہ جو کچھ ہے، اسے مان لیں، نہ یہ کہ جو کچھ ہے، اس کا انکار کر دیں، حقیقت کا انکار کر کے آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے، وہ حقیقت کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

فٹ نوٹ:۔

صفحہ نمبر ۳۵:۔ J.Huxley,man in modern world.p.129.

صفحہ نمبر ۳۹:۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں خرد شچیف کی برطرفی اور اس کے واقعات سے تصدیق ہو چکی ہے۔

صفحہ نمبر ۴۲:۔ (Limitations of science,pp.133.)

صفحہ نمبر ۴۳:۔ Mysterious universe,p.189.(2)THE evidence of God,p179.(1)

استدلال کا طریقہ

مذہب کے خلاف دور جدید کا جو مقدمہ ہے، وہ اصلاً طریق استدلال کا مقدمہ ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی نے حقیقت کے مطالعہ کا جو اعلیٰ اور ارتقاء یافتہ طریقہ معلوم کیا ہے، مذہب کے دعوے اور عقیدے اس پر پورے نہیں اترتے، یہ جدید طریقہ مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ حقائق کو معلوم کرنے کا طریقہ ہے، اب چونکہ مذہب کے عقائد ورائے احساس دنیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آسکتے، ان استدلال تمام تر قیاس اور استقراء پر مبنی ہے، اس لئے وہ غیر حقیقی ہیں ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

مگر یہ مقدمہ بجائے خود صحیح نہیں، جدید طریقہ مطالعہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف وہی چیز اپنا حقیقی وجود رکھتی ہے، جو براہ راست ہمارے تجربے میں آئی ہو، بلکہ براہ راست تجربے میں آنے والی چیزوں کی بنیاد جو علمی قیاس کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی طرح حقیقت ہوسکتا ہے، جیسے کوئی تجربہ۔ نہ تجربہ محض تجربہ ہونے کی بنا پر صحیح ہے، اور نہ قیاس محض قیاس ہونے کی بنا پر غلط، دونوں میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔

پہلے زمانے میں سمندری جہاز لکڑی کے بنائے جاتے تھے، کیونکہ تصور یہ تھا کہ پانی پر وہی چیز تیر سکتی ہے جو وزن میں پانی سے ہلکی ہو، جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ لوہے کے جہاز بھی پانی پر اسی طرح تیر سکتے ہیں، جس طرح لکڑی کے جہاز سطح بحر پر چلتے ہیں تو اس بناء پر اس اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا کہ لوہا وزنی ہونے کی وجہ سے پانی کی سطح پر تیر ہی نہیں سکتا، کسی لوہار نے اس دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لئے پانی کے ٹب میں لوہے کا نعل ڈال کر دکھا دیا کہ وہ پانی کی سطح پر تیرنے کے بجائے ٹب کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے، بظاہر یہ ایک تجربہ تھا، مگر یہ تجربہ صحیح نہیں تھا، کیونکہ اس نے اگر پانی میں لوہے کا تسلہ ڈالا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ دعویٰ کرنے والے کا دعویٰ صحیح ہے۔

اسی طرح ابتداء میں جب کم طاقت کی دوربینوں سے آسمان کا مشاہدہ کیا گیا تو بہت سے ایسے اجسام مشاہدے میں آئے جو پھیلے ہوئے طور کی مانند دکھائی دے رہے تھے، اس مشاہدے کی بناء پر یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ یہ گیسی بادل ہیں جو ستارے بننے کے پہلے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں، مگر جب مزید طاقت کی دوربینیں تیار ہوئیں اور ان کے ذریعے ازسرنو ان اجسام کو دیکھا گیا تو نظر آیا کہ جو چیز پہلے نورانی بادل کی مانند دکھائی دیتی تھی وہ دراصل بے شمار ستاروں کا مجموعہ تھا، جو غیر معمولی دوری کی وجہ سے بادل کی مانند نظر آ رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ مشاہدہ اور تجربہ نہ صرف یہ کہ بذات خود علم کے قطعی ذرائع نہیں ہیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ علم صرف ان چیزوں کا نام نہیں جو براہ راست ہمارے مشاہدے و تجربہ میں آتی ہوں دور جدید نے بے شک بہت سے آلات اور ذرائع دریافت کر لئے ہیں جن سے وسیع پیمانے پر تجربہ و مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، مگر یہ آلات و ذرائع جن چیزوں کا ہمیں تجربہ کراتے ہیں، وہ صرف کچھ اوپری اور نسبتاً غیر اہم چیزیں ہوتی ہیں، نظریات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری سائنس کچھ مشاہدات کی توجیہہ کا نام ہے یعنی خود نظریات وہ چیزیں نہیں ہیں، جو ہمارے مشاہدے یا تجربے میں آئے ہوں، بلکہ کچھ تجربات و مشاہدات نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا ہے کہ یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ خود مشاہدہ میں نہیں آئی، کوئی سائنس داں یا مادہ پرست فورس، انرجی، نیچر، قانون فطرت، وغیرہ الفاظ استعمال کئے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتا، مگر کوئی بھی سائنس داں نہیں جانتا کہ قوت یا نیچر کیا ہے، سوا اس کے کہ معلوم واقعات و ظواہر کی نامعلوم اور ناقابل مشاہدہ علت کے لئے چند مختلف تعبیری الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں، جن کی حقیقت معنوی کی تشریح سے ایک سائنس داں بھی اسی طرح عاجز ہے جس طرح اہل مذاہب خدا کی تشریح و توصیف سے دونوں اپنی ایک نامعلوم علت کنہات

پر غیبی اعتقاد رکھتے ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں۔

''ریاضیاتی کائنات قیاسات اور مفروضات کا ایک شاندار جال ہے جس میں علامتوں کی مساوات (equations of symbols.) پر مشتمل نا قابل بیان مجردات (abstractions.) کے سوا اور کچھ نہیں۔''

(man the unkown,p.15.)

سائنس ہرگز یہ دعوی نہیں کرتی اور نہیں کر سکتی کہ حقیقت صرف اس قدر ہے، جو حواس کے ذریعہ بلا واسطہ ہمارے تجربے میں آئی ہو، یہ واقعہ کہ پانی ایک رقیق اور سیال چیز ہے، اس کو ہم براہ راست اپنی آنکھوں کے ذریعے دیکھ لیتے ہیں، مگر یہ واقعہ کہ پانی کا ہر مالیکول ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کے ایک ایٹم پر مشتمل ہے، یہ ہم کو آنکھ سے یا کسی خوردبین سے نظر نہیں آتا، بلکہ صرف منطقی استنباط کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اور سائنس ان دونوں واقعات کی موجودگی یکساں طور پر تسلیم کرتی ہے، اس کے نزدیک جس طرح وہ عام پانی ایک حقیقت ہے، جو مشاہدہ میں نظر آ رہا ہے، اسی طرح وہ تجزیاتی پانی بھی ایک حقیقت ہے جو قطعاً نا قابل مشاہدہ ہے، اور صرف قیاس کے ذریعے معلوم کیا گیا ہے، یہی حال دور سے تمام حقائق کا ہے، اے، ای، مینڈر (a.e.mander.) لکھتا ہے

''جو حقیقتیں ہم کو براہ راست حواس کے ذریعے معلوم ہوں، وہ محسوس حقائق (perceived facts.) ہیں، مگر جن حقیقتوں کو ہم جان سکتے ہیں وہ صرف انھیں محسوس حقائق تک محدود نہیں ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سی حقیقتیں ہیں جن کا علم اگرچہ براہ راست ہم حاصل نہیں کر سکتے، پھر بھی ہم ان کے بارے میں جان سکتے ہیں، اس علم کا ذریعہ استنباط ہے، اس طرح جو حقیقتیں معلوم ہوں، ان کو استنباطی حقائق (inferred.) کہا جا سکتا ہے، یہاں یہ بات اہمیت کے ساتھ سمجھ لینے کی ہے کہ دونوں میں اصل فرق ان کے حقیقت ہونے

کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ ایک صورت میں ہم ''اس کو جانتے ہیں اور دوسری صورت میں ''اس کے بارے میں معلوم کرتے ہیں حقیقت بحر حال حقیقت ہے خواہ ہم اس کو براہ راست مشاہدہ سے جانیں یا بہ طریق استنباط معلوم کریں۔''

(clearer thinking,(london 1949)p,49)

وہ مزید لکھتا ہے:

''کائنات میں جو حقیقتیں ہیں، ان میں سے نسبتاً تھوڑی تعداد کو ہم حواس کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں، پھر ان کیعلاوہ جو اور چیزیں ہیں، ان کو ہم کیسے جانیں، اس کا ذریعہ استنتاج (inference.) یا تعقل (reasoning.) ہے، استنتاج یا تعقل ایک طریق فکر ہے، جس کے ذریعے سے ہم کچھ معلوم واقعات سے آغاز کر کے بالآخر یہ عقیدہ بناتے ہیں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے اگر چہ وہ کبھی دیکھی نہیں گئی۔'' (ایضاً صفحہ ۴۹)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقلی اور منطقی طریقہ، حقیقت کو معلوم کرنے کا ذریعہ کیوں کر ہے، جس کو ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور کبھی اس کے وجود کا تجربہ کیا، اس کے متعلق محض عقلی تقاضے کی بناء پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقت ہے، مینڈر کے الفاظ اس کا جواب یہ ہے:۔

معنی: یعنی منطقی استخراج کے ذریعہ حقیقت کو معلوم کرنے کا طریقہ صحیح ہے، کیونکہ کائنات میں خود منطقیت ہے عالم واقعات ایک ہم آہنگ کل ہے، کائنات کے تمام حقائق ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان کے درمیان زبردست نظم اور باقاعدگی پائی جاتی ہے، اس لئے مطالعہ کا کوئی ایسا طریقہ جو واقعات کی ہم آہنگی اور ان کی موزونیت کو ہم پر واضح نہ کرے، صحیح نہیں ہو سکتا، مینڈر یہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

''نظر آنے والے واقعات محض عالم حقیقت کے کچھ اجزاء (patches of fact.) ہیں، وہ سب کچھ جن کو ہم حواس کے ذریعے جانتے ہیں وہ محض جزوی اور غیر مربوط واقعات ہوتے ہیں، اگر الگ سے صرف انہی کو دیکھا جائے تو وہ بے معنی معلوم ہوں گے، براہ راست محسوس ہونے والے واقعات کے ساتھ اور بہت سے غیر محسوس واقعات کو ملا کر جب دیکھتے ہیں، اس وقت ہم ان کی معنویت کو سمجھتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ ایک سادہ سی مثال سے اس حقیقت کو سمجھاتا ہے:

''ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چڑیا مرتی ہیہم دیکھتے ہیں کہ ایک پتھر کو زمین سے اٹھانے کے لئے طاقت خرچ کرنی پڑتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ چاند آسمان پر گھوم رہا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ چاند آسمان پر گھوم رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑی سے اترنے کے مقابلے میں چڑھنا زیادہ مشکل ہے، اسی طرح کے ہزاروں مشاہدات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نہیں، اس کے بعد ایک استنباطی حقیقت (inferred facts.) انکشاف ہوتا ہے۔۔۔ یعنی تجاذب (gravitation.) کا قانون، اس کے فوراً بعد ہمارے یہ تمام مشاہدات اس استنباطی حقیقت کے ساتھ مل کر باہم مربوط ہو جاتے ہیں، اور اس طرح بالکل پہلی بار ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف واقعات کے درمیان نظم با قاعدگی اور موافقت ہے، محسوس واقعات کو اگر الگ سے دیکھا جائے تو وہ بے ترتیب، غیر مربوط اور متفرق معلوم ہوں گے، مگر محسوس واقعات اور استنباطی حقائق دونوں کو ملا دیا جائے تو وہ ایک منظم شکل اختیار کر لیتے ہیں۔'' (صفحہ ۵۱)

اس کتاب میں تجاذب کا قانون ایک تسلیم شدہ سائنسی حقیقت ہونے کے باوجود بذات خود قطعاً ناقابل مشاہدہ ہے، سائنس دانوں نے جس چیز کو دکھایا تجربہ کیا وہ خود قانون کشش نہیں، کچھ دوسری چیزیں ہیں، اور ان دوسری چیزوں کو منطقی توجیہہ کے طور پر ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں کوئی چیز موجود ہے، جس کو ہم قانون تجاذب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ قانون تجاذب آج ایک مشہور ترین سائنسی حقیقت کے طور پر ساری دنیا میں جانا جاتا ہے، اس کو پہلی بار نیوٹن نے دریافت کیا، مگر خالص تجرباتی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت کیا ہے، اس کو نیوٹن کی زبان سے سنئے، اس نے بنٹلی کو ایک خط میں لکھا تھا، جو اس کے مجموعے میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:۔

''یہ نا قابل فہم ہے کہ بے جان اور بے حس مادہ کسی درمیانی واسطہ کے بغیر دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے، حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا۔''

ایک ایسی نا قابل مشاہدہ اور نا قابل فہم چیز کو آج بلا اختلاف سائنسی حقیقت سمجھا جاتا ہے، کیوں، صرف اس لئے کہ اگر ہم ان کو مان لیں تو ہمارے کچھ مشاہدات ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہو، بلکہ وہ غیر مرئی عقیدہ بھی اسی وجہ کی ایک حقیقت ہے جس سے ہم مختلف مشاہدات کو اپنے ذہن میں مربوط کر سکتے ہوں، جو معلوم واقعات کی معنویت ہم پر واضح کر سکے، مینڈر لکھتا ہے۔

''یہ کہنا کہ ہم نے ایک حقیقت معلوم کو معلوم کر لیا ہے، دوسرے لفظوں میں گویا یہ کہنا ہے کہ ہم نے اس کی معنویت (meaning) کو معلوم کر لیا ہے، یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم کسی چیز کی موجودگی کے سبب اور اس کے حالات کو معلوم کر کے اسکی تشریح کرتے ہیں، ہماری بہتر یقینیات (beliefs.) اسی نوعیت کی ہیں، وہ

دراصل مشاہدات کی توضیح (statements of observation.) ہیں۔''

اس بحث کے بعد مینڈر مشہور حقائق (obseryed facts.) کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''جب ہم کسی مشاہدے (observation) کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیشہ ہم مجرد حسیاتی مشاہدے سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں، اس سے مراد حسیاتی مشاہدہ نیز معرفت (recognition.) ہوتا ہے جس میں تعبیر کا جز بھی شامل ہوتا ہو۔'' (works of w.bently 111,p,221.)

یہی وہ اصول ہیں جس کی بنیاد پر عضویاتی ارتقا (organic evolution.) کے حقیقت ہونے پر سائنسدانوں کا اجتماع ہو گیا مینڈر کے نزدیک یہ نظریہ'' اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا کہ اس کو تقریباً حقیقت (approximate certainty.) کہا جا سکتا ہے'' سمپسن (G.G.simpson.) کے الفاظ میں نظریہ ارتقاء آخری اور مکمل طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے نہ کہ محض ایک قیاس یا متبادل مفروضہ جو سائنسی تحقیق کے لئے قائم کر لیا گیا ہو'' انسائکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۸ء) کے مقالہ نگار نے حیوانات میں ارتقاء کو بطور ایک حقیقت (truth.) تسلیم کیا ہے، اور کہا ہے کہ ڈارون کے بعد اس نظریے کو سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ طبقے کا قبول عام (general) حاصل ہو چکا ہے (R.S.lull.) لکھتا ہے:۔

''ڈارون کے بعد سے نظریہ ارتقاء دن بدن زیادہ قبولیت حاصل کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس بارے کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد منطقی طریقہ ہے، جس کے تحت عمل تخلیق کی

توجیہہ ہوسکتی ہے،اور اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔"

(Organic evolution,p.15.)

یہ نظریہ جس کی صداقت پر سائنس دانوں کا اس قدر اتفاق ہوگیا اسے کسی نے دیکھا ہے، یا اس کا تجربہ کیا ہے۔۔ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ایسا ہوسکتا، ارتقاء کا مزعومہ عمل اتنا پیچیدہ ہے، اور اتنے بعید ترین ماضی سے متعلق ہے جس کو دیکھنے یا تجربہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،لل کے مذکورہ بالا الفاظ کے مطابق یہ صرف ایک منطقی طریقہ" ہے جس سے تخلیقی مظاہر کی توجیہہ کی جاتی ہے نہ کہ واقعی مشاہدہ، چنانچہ سر آرتھر کیتھ جو خود بھی ارتقاء کا حامی ہے،اس نے ارتقاء کو مشاہداتی یا تجرباتی حقیقت کے بجائے ایک "عقیدہ" قرار دیا ہے،اس کے الفاظ میں (evolution is a basic dogma of rationalism)

(revolt against reason,p112.)

یعنی نظریہ ارتقاء مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے چنانچہ ایک سائنسی انسائیکلوپیڈیا میں ڈاروزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے جس کی بنیاد پر توجیہہ بلا مشاہدہ (explanation without demonstration.) پر قائم ہے

پھر ایک ایسی غیر مشاہد اور نا قابل تجربہ چیز کو علمی حقیقت کیوں سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ اے،ای مینڈر کے الفاظ میں یہ ہے:۔

۱۔یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ (consistent.) ہے۔

۲۔اس نظریے میں بہت سے واقعات کی توجیہہ مل جاتی ہے، جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جاسکتے۔

۳۔دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔(صفحہ ۱۱۲)

اگر یہ استدلال نظریہ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کیلئے کافی ہے تو یہی استدلال

بدر جہاز یا وہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے۔ ۔ایسی حالت میں نظریہ ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دینا اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لئے نا قابل قبول ٹھہرانا صرف اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آپ کا مقدمہ اصلاً ''طریق استدلال'' کا مقدمہ نہیں ہے، بلکہ وہ نتیجہ سے متعلق ہے، ایک ہی طریق استدلال سے اگر کوئی خالص طبیعیاتی نوعیت کا واقعہ ثابت ہو تو آپ فوراً اسے قبول کر لیں گے اور اگر کوئی الٰہیاتی نوعیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے رد کر دیں گے، کیوں کہ یہ نتیجہ آپ کو پسند نہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے، اور سائنس ایمان بالشہود کا، حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ہی ایمان بالغیب پر عمل کرتے ہیں مذہب کا اصل دائرہ اشیا کی اصلی اور آخری حقیقت متعین کرنے کا دائرہ ہے، سائنس اسی وقت تک مشاہداتی علم ہے جب تک وہ ابتدائی اور خارجی مظاہر پر کلام کر رہی ہو، جہاں وہ اشیاء کی آخری اور حقیقی حیثیت متعین کرنے کے میدان میں آتی ے، جو کہ مذہب کا اصلی میدان ہے، تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح 'ایمان بالغیب'' کا طریقہ اختیار کرتی ہے، جس کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے، کیونکہ اس میدان میں اس کے سوا چارہ نہیں، بقول سر آرتھر اڈنگٹن (sir arthur eddingtion.) دور جدید کا سائنس داں جس میز پر کام کر رہا ہے وہ بیک وقت دو میزیں ہیں، ایک میز تو وہی ہے جو ہمیشہ سے عام انسانوں کی میز رہی ہے اور جس کو چھونا اور دیکھنا ممکن ہے۔ ۔دوسری میز اس کی علمی میز (scientifc table.) ہے اس کا بیشتر حصہ خلا ہے، اور اس م، یں بے شمار نا قابل مشاہدہ الیکٹران دوڑ رہے ہیں، اسی طرح ہر چیز کے مثنیٰ (duplicate.) ہیں، جن میں سے ایک قابل، مشاہدہ ہے، اور دوسرا صرف تصوراتی ہے، اس کو کسی بھی خوردبین سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

(nature of physical world,p.7--8.)

جہاں تک چیزوں کی شکل اول کا تعلق ہے، اس کو بے شک سائنس دیکھتی ہے، اور بہت دور تک دیکھتی ہے، مگر اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے شکل ثانی کیو بھی دیکھ لیا ہے، اس میدان میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت کے مظاہر کو دیکھ کر اسکے بارے میں ایک رائے قسم کرتی ہے، گویا جہاں تک اس دوسرے میدان۔۔اشیا کی آخری حقیقت معلوم کرنے کے میدان۔۔۔کا تعلق ہے، سائنس نام ہے، معلوم حقائق کی مدد سے نامعلوم حقائق دریافت کرنے کا۔

جب سائنس داں کے پاس مشاہداتی حقائق (جن کو درحقیقت وجدان صورت پذیر کرتا ہے) کی کچھ تعداد فراہم ہوجاتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب اسے ایک ایسے مفروضے یا نظریہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک وجدانی یا اعتقادی تصور کی ضروت ہے، جو ان مشاہدات کی تشریح کرے، ان کو منظم کرے، اور ان کو ایک وحدت میں پرو دے، لہذا وہ اس قسم کا ایک واجدانی مفروضہ ایجاد کرتا ہے، اگر یہ مفروضہ فی الواقع ان تمام حقائق کی معقول تشریح کررہا ہو، ایک ایسی ہی قابل یقین حقیقت شمار کیا جاتا ہے، جیسی کہ کوئی اور علمی حقیقت جس کو سائنس داں ''مشاہدہ'' قرار دیتا ہے، اگر چہ یہ حقیقت سائنس دانوں کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کبھی مشاہدہ میں نہ آئیہو، مگر یہ غیر مرئی صرف اس لئے حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ دوسرا مفروضہ ایسا نہیں ہے، جو ان مشہور حقائق کی واقعی تشریح کرتا ہو۔

گویا سائنس داں ایک غائب چیز کی موجودگی پر اس نتائج واثرات کی وجہ سے یقین کرلیتا ہے، ہر وہ حقیقت جس پر ہم یقین کرتے ہیں، شروع میں ایک مفروضہ ہی ہوتی ہے، پھر جوں جوں نئے حقائق منکشف ہوکر اس مفروضے کی تائید کرتے جاتے ہیں، اس مفروضے کی صداقت نمایاں ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ اسپر ہمارا یقین، حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے، اگر آشکارہ ہونے والے حقائق اس

مفروضہ کی تائید نہ کریں تو ہم اس مفروضہ کو غلط سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں، اس قسم کی نا قابل انکار حقیقت کی ایک مثال جس پر سائنس داں ایمان بالغیب رکھتا ہے ''ایٹم'' ہے، ایٹم کو آج تک معروف معنوں میں دیکھا نہیں گیا، مگر اسکے باوجود وہ جدید سائنس کی سب سے بڑی تسلیم شدہ حقیقت ہے، اسی بناء پر ایک عالم نے سائنسی نظریات کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

Theries are mental pictures that explain known laws.

نظریات دراصل ذہنی نقشے ہیں، جو معلوم قوانین کی توجیہہ کرتے ہیں۔

سائنس کے میدان میں جن ''حقائق'' کو مشاہداتی حقائق (Observed facts.) کہا جاتا ہے، وہ دراصل مشاہداتی حقائق نہیں بلکہ کچھ مشاہدات کی تعبیریں ہیں، اور چونکہ انسانی مشاہدہ کو کامل نہیں کہا جا سکتا، اس لئے یہ تعبیریں بھی تمام کی تمام اضافی ہیں، اور مشاہدہ کی ترقی سے تبدیل ہو سکتی ہے، جے، ڈبلو، این، سولیون (sullivan.) سائنسی نظریات پر ایک تبصرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''سائنسی نظریات کے اس جائزے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک صحیح سائنسی نظریہ محض یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک کامیاب عملی مفروضہ (successful working hypothesis.) ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ تمام سائنسی نظریات اصلاً غلط ہوں، جن نظریات کو آج ہم تسلیم کرتے ہیں، وہ محض ہمارے موجودہ حدود مشاہدہ کے اعتبار سے حقیقت ہیں حقیقت (thurth.) اب بھی سائنس کی دنیا میں ایک علمی اور افادی مسئلہ (pragmatic affair.) ہے۔''

اس کے باوجود سائنس داں ایک مفروضہ کو جو اس کے مشاہداتی حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو، مشاہداتی حقائق تو سائنس ہیں لیکن وہ نظریہ جو ان کی تشریح کرتا ہے وہ سائنس نہیں ۔۔۔ اسی کا نام ایمان بالغیب، ایمان بالغیب مشہود حقائق کی صحیح ترین توجیہہ ہے جس طرح نیوٹن کے نظریہ روشنی (corpuscular theory of light.) کو بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے اس لئے رد کر دیا کہ وہ مظاہر نور کی تشریح میں ناکام نظر آئی، اسی طرح ہم بے خدا مفکرین کے نظریہ کائنات کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ وہ حیات و کائنات کے مظاہر کی تشریح میں ناکام ہے، مذہب کے بارے میں ہمارے یقین کا ماخذ عین وہی چیز ہے، جو ایک سائنس داں کے لئے کسی سائنسی نظریے کے بارے میں ہوتا ہے، ہم مشاہداتی حقائق کے مطالعہ ہی سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذہب کی تشریحات عین حق ہیں، اور اس درجہ حق میں کہ ہزاروں برس گزرنے کے باوجود ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، ہر وہ انسانی نظریہ جواب سے چند سو برس پہلے بنایا گیا، وہ نئے مشاہدات و تجربات کے ظہور میں آنے کے بعد مشتبہ اور مردود ہو چکا ہے، مگر اس کے برعکس مذہب ایک ایسی صداقت ہے، جو ہر نئی تحقیق سے اور نکھرتی جا رہی ہے، ہر واقعی دریافت اس کے لئے تصدیق بنتی چلی جاتی ہے۔

اگلے صفحات میں ہم اسی پہلو سے مذہب کے بنیادی تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

فٹ نوٹ:۔

صفحہ نمبر ۴۶: ۔مثلاً خدا کے اثبات کے لئے یہ نہیں کرتے کہ خود خدا کو دوربین کے ذریعہ سے دکھا دیں استدلال کرتے ہیں کہ کائنات کا نظم اور اس کی معنویت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خدا ذہن موجود ہے، اس طرح ہماری دلیل براہ راست خدا کو ثابت نہیں کرتی بلکہ ایسے قرینہ کو ثابت کرتی ہے جس کے منطقی نتیجہ

کے طور پر خدا کو ماننا پڑے۔

صفحہ نمبر۵۲:۔ Meaning of evolution ,p127 (2)clearer thinking,p.113.(1)

صفحہ نمبر ۵۳:۔ Revolt against reason,p111.

صفحہ نمبر:۔۵۶:۔ limition of science,p.158.

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

عرصہ ہوا کہ، کیرالا کے عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جس کا نام تھا۔

nature and science speak about god .

اس باب کے عنوان کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ موزوں ترین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا سب سے بڑا ثبوت اسکی وہ مخلوق ہے، جو ہمارے سامنے موجود ہے، فطرت اور اس کے بارے میں ہمارا بہترین علم پکار رہا ہے کہ بے شک اس دنیا کا ایک خدا ہے، اس کے بغیر ہم کائنات کو اور اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتے۔

کائنات کی موجودگی، اس کے اندر حیرت انگیز تنظیم اور اس کیا تھا معنویت کی اس کے سوا کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی کہ اس کو کسی نے بنایا ہے، اور یہ بنانے والا ایک لا محدود ذہن ہے، نہ کہ کوئی اندھی طاقت۔

ا۔ فلسفیوں میں سے ایک گروہ، نہایت مختصر گروہ، ایسا ہے جو کسی قسم کے وجود ہی میں شک کرتا ہے، اس کے نزدیک نہ یہاں کوئی انسان ہے، اور نہ کوئی کائنات، بس ایک عدم محض ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں اگر اس نقطۂ نظر کو صحیح مان لیا جائے تو یقیناً خدا کا وجود مشتبہ ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی ہم کائنات کا مانتے ہیں، ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔۔ کیونکہ عدم سے وجود کا پیدا ہونا ایک نا قابل قیاس بات ہے۔

جہاں تک اس مخصوص قسم کی شکیک اور لا ادریت کا تعلق ہے، وہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہوسکتا ہے مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا سوچنا خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی وجود ہے، جب راستے چلتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکراتے ہیں، اور ہمیں تکلیف ستانے لگتی ہے تو یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارے باہر کوئی دنیا ہے، جس کا اپنا وجود ہے، اسی طرح ہمارا ذہن ور ہمارے تمام حواس ہر آن بے شمار چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، اور یہ علم و احساس ہر

شخص کے لئیاس بات کا ایک ذاتی ثبوت ہے، کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے تو یہ ایک ایسی مشتثنیٰ حالت ہے جو کروڑوں انسانوں کے تجربات سے غیر متعلق ہے، ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص قسم کی ذہنی فضا میں گم ہو گیا ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا ہے

اگر چہ کائنات کا وجود نہ ہونا بذات خود اس بات کا کوئی لازمی ثبوت نہیں ہے کہ خدا بھی موجود نہ ہو، تاہم اپنی انتہائی لغویت کے باوجود یہی ایک نقطۂ نظر ہے جس کے لئے خدا کا وجود مشتبہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نقطۂ نظر خود اتنا بے معنی ہے کہ آج تک نہ تو عام انسانوں کے لئے وہ قابل فہیم ہو سکا اور نہ علمی دنیا میں اس کو قبول عام حاصل ہوا، عام انسان اور عام اہل علم بحر حال اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک وجود ہے، اور کائنات بھی اپنا ایک وجود رکھتی ہے، سارے علوم اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی علم و یقین کی بنیاد پر قائم ہیں۔

پھر جب ایک کائنات ہے تو لازماً اس کا خدا بھی ایک ہونا چاہیے، یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم مخلوق کو مانیں مگر خالق کا وجود تسلیم نہ کریں، ہمیں کسی بھی ایسی چیز کا علم نہیں جو پیدا کئے بغیر وجود میں آ گئی ہو، ہر چھوٹی بڑی چیز لازمی طور پر اپنا ایک سبب رکھتی ہے، پھر اتنی بڑی کائنات کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ یونہی وجود میں آ گئی، اس کا کوئی خالق نہیں۔

جان اسٹوارٹ مل (stuart ill.) نے اپنی آٹو بیا گریفی میں لکھا ہے کہ میرے باپ نے مجھے یہ سبق دیا کہ یہ سوال کہ کس نے مجھے پیدا کیا (who made me.) خدا کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد فوراً دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا (who made god.) چنانچہ برٹرینڈ رسل نے بھی اسی اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے محرک اول کے استدلال کو رد کر دیا ہے:۔

(the age of analysis,,by morton whithe,p21-22.,,)

یہ منکرینِ خدا کا بہت پرانا استدلال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا، پھر جب خدا کو ازلی ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی مان لیا جائے اگر چہ بالکل بے معنی بات، کیونکہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے، جس کی بناء پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے۔ تاہم انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہر فریب حُسن ضرور موجود تھا، مگر اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون۔ (second low of thermoby namics.) کے انکشاف کے بعد تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔

یہ قانون جیسے ضابطہ نا کارگی (low of entropy.) کہا جاتا ہے، ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی، ضابطہ نا کارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل یا حرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر اس چکر کو الٹا چلایا نہیں جا سکتا کہ خود بخود یہ حرارت، کم حرارت کے وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے، نا کارگی، دستیاب توانائی (available enegry.) اور غیر دستیاب توانائی (unavailable energy.) کے درمیان تناسب کا نام ہے، اور اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی نا کارگی برابر بڑھ رہی ہے اور ایک وقت ایسا آنا مقدور ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی، اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی، لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے ورنہ اخراج حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔

اس جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالم حیوانات (edward luther kessel.) لکھتا ہے:۔

''اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز (beginning.) رکھتی ہے اور ایسں اکرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے، کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔'' (the evidence of god,p.51.)

یہی بات سر جیمز جینز نے ان الفاظ میں کہی ہے:

''موجودہ سائنس کا یہ خیال ہے کہ کائنات میں ناکارگی کا عمل (entropy.) ہمیشہ جاری رہے گا یہاں تک کہ اس کی توانائی بالکل ختم ہو جائے، یہ ناکارگی ابھی اپنے آخری درجہ کو نہیں پہنچی ہے، اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو ہم اسکے متعلق سوچنے کے لئے موجود نہ ہوتے یہ ناکارگی اس وقت بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اور اس بنا پر اس کا آغاز ہونا ضروری ہے کائنات میں لازماً اس قسم کا کوئی عمل ہوا ہے، جس کو ہم ایک وقت خاص میا □○تخلیق (creation at a time.) کہہ سکتے ہیں، نہ یہ جو وہ لامتناہی مدت سے موجود ہے۔''

(themysterious universe.p.133.)

اس طرح کے اور بھی طبیعیاتی شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک محدود عمر رکھتی ہے، مثلاً فلکیات کا یہ مشاہدہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے، تمام کہکشائیں اور فلکیاتی اجسام مشاہدہ میں نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس صورتحال کی اس وقت نہایت عمدہ توجیہہ ہو جاتی ہے، جب ہم ایک ایسے ابتدائی وقت کو تسلیم کر لیں،

جب تمام اجزائے ترکیبی مجتمع اور مرکوز حالت میں تھے اور اس کے بعد ان میں حرکت اور توانائی کا آغاز ہوا، اس طرح کے مختلف قرائن کی بنا پر عام اندازہ یہ ہے کہ لگ بھگ پچاس کھرب سال پہلے ایک غیر معمولی دھماکہ سے یہ سارا عالم وجود میں آیا، اب سائنس کی اس دریافت کو ماننا کہ کائنات محدود عمر رکھتی ہے، اور اس کے موجد کو نہ ماننا، ایسا ہی ہے، جیسے کوئی شخص یہ تو تسلیم کرے کہ تاج محل ہمیشہ سے موجود نہیں تھا، بلکہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں بنا، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی معمار اور انجنیر تسلیم نہ کرے اور کہے کہ وہ بس اپنے آپ ایک مخصوص تاریخ کو بن کر کھڑا ہو گیا ہے!

۲۔ فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں، شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے، انمیں کچھ ستارے ایسے ہیں جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جا سکتی ہیں اور بعض ستارے تو اتنے بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سما سکتی ہیں، یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے پھر اتنی وسعت کے باوجود کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔

بلکہ ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر ایک ستتیس (۱۳۰) کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنا ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔

آسمان گرد و غبار سے پاک ہو تو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جا سکتے

ہیں لیکن معمولی دوربینوں کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہو جاتی ہے اور وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلومر پر لگی ہوئی ہے، اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں، مگر یہ تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے، کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کر رہے ہیں، کچھ ستارے سفر کر رہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی شکل میں ہیں اور بے شمار ستارے ایسے ہیں، جو مجامع النجوم کی صورت میں متحرک ہیں، روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بے شمار ذرے ادھر ادھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کر سکتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ملے ہوئے حرکت کرتے ہیں، اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود بالکل یکہ و تنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے، ہر جھرمٹ کو کہکشاں کہتے ہیں، اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں، سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں، وہ چاند ہے، چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ۲۹ ایک بٹا دو دن میں زمین کے گرد اس کا چکر پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ بناتی ہے، جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں، اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں، ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب

میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے، یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (asteroids.) کا ایک حلقہ ہزاروں دم دار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہین جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں، ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے، جس کو ہم سورج کہتے ہیں اور جس کا قطر آٹھ لاکھ ۲۵ ہزار میل ہے، اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لئے ہوئے ایک عظیم کہکشاں نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ رفتار سے گردش کر رہا ہے، اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں، جن سے مل کر ایک کہکشاں وجود میں آتی ہے، کہکشاں گویا بہتیری پلیٹ ہے جس پر بے شمار تارے منفرداً اور مجتمعاً لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں، پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں، چنانچہ دو قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے، وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کر رہی ہے کہ اس کا ایک دور بیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سو ملین، (ایک ملین برابر دس لاکھ) کہکشانوں پر مشتمل ہے، اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم وبیش ستارے پائے جاتے ہیں، قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نور ہے اور ہم زمین کے رہنے والے کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں، پھر یہ کہکشاں ایک بڑی کہکشاں کا جزو ہے، جس میں اس طرح کی سترہ کہکشائیں حرکت کر رہی ہیں، اور پورے مجموعے کا قطر بیس لاکھ سال نور ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے، اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبارے کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے، ہمارا سورج ہیبت ناک

تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کی طرف بھاگ رہا ہے، اور اپنے ساتھ نظام شمسی کے تمام توالع کو بھی لئے جا رہا ہے اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ ہے، کسی کی ۳۳ میل فی سکنڈ اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دور بھاگے جا رہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا، زمین کی حرکت سورج کے گرد ہر درجہ منضبط ہے، اسی طرح اپنے محور کے اوپر اس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدی کے اندر بھی اس میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا، زمین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں، اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے وہ بھی ۱۸ ہی ایک بٹا ۲ سال کے نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جاتا ہے، یہی تمام اجرام سماوی کا حال ہے، حتیٰ کہ ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اکثر خلائی گردش کے دوران ایک پورا کہکشاں نظام، جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے اور پھر اس سے نکل جاتا ہے، مگر باہم کسی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ اس عظیم اور حیرت انگیز تنظیم کو دیکھ کر عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے آپ نہیں قائم ہے بلکہ کوئی غیر معمولی طاقت ہے جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم رکھا ہے۔

یہی ضبط و نظم جو بڑی بڑی دنیاؤں کے درمیان نظر آتا ہے، وہی چھوٹی دنیاؤں میں بھی انتہائی مکمل شکل میں موجود ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے چھوٹی دنیا ایٹم ہے، ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے نظر نہیں آتا، حالانکہ جدید خوردبین کسی بھی چیز کو دگنا بڑھا کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے،

ایٹم کی حقیقت انسانی قوت بصارت کے اعتبار سے ''لاشے'' سے زیادہ نہیں، مگر اس انتہائی چھوٹے ذرے کے اندر حیرت انگیز طور پر ہمارے شمسی نظام کی طرح ایک زبردست گردشی نظام موجود ہے، ایٹم برق پاروں کے ایک مجموعے کا نام ہے، مگر یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے، سیسہ کا ایک ٹکڑا جس میں ایٹمی ذرات کافی سختی اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، اگر الیکٹرانا ور پروٹون کی دو ٹکڑوں کی حیثیت سے تصویر بنائی جائے تو دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۳۵۰ گز ہوسکتا ہے یا ایٹم کا تصور گرد کے ایک غیر مرئی ذرہ کی حیثیت سے کیا جاسکے تو الکٹرون کی گردش سے جو حجم بنتا ہے، اس کی مقدار ایک ایسے فٹ بال کی سی ہوسکتی ہے، جس کا قطر آٹھ فٹ ہو۔

ایٹم کے منفی برق پارے جو الکٹرون کہلاتے ہیں، وہ مثبت برق پارے کے گرد گھومتے ہیں، جن کو پروٹون کہا جاتا ہے، یہ برقیے، جو روشنی کی کرن کے ایک موہوم نقطۂ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، اپنے مرکز کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں، جیسے زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور یہ گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الکٹرون کا کسی ایک جگہ تصور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا وہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے، وہ اپنے مدار پر ایک سکنڈ میں ہزاروں ارب چکر لگالیتا ہے۔

یہ ناقابل قیاس اور ناقابل مشاہدہ تنظیم اگر سائنس کے قیاس میں اس لئے آجاتی ہے کہ اس کے بغیر ایٹم کے عمل کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی تو ٹھیک اسی دلیل سے آخر ایک ایسے ناظم کا تصور کیوں نہیں کیا جاسکتا جس کے بغیر ایٹم کی اس تنظیم کا برپا ہونا محال ہے۔

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ہم کو

تعجب ہوتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ مدن سے ملبورن کے لئے کال چند منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہیجو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (nervous system.) ہے جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے، اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروڑوں خبریں ادھر ادھر رہتی ہیں، جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے، مختلف اعضاء کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے، اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہو تو ہمارا پورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک الگ الگ اپنے راستے پر چل رہا ہو۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز بھیجا ہے، آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (nerve cells.) ہیں، ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (nerve fibres.) کہتے ہیں، ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر (۷۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے، انھیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور سارا عمل کرتے ہیں، زبان میں تین ہزار ذائقے خانے (taste buds.) ہیں، جن میں ہر ایک اپنے علیحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے، انھیں کے ذریعے وہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے، کان میں ایک لاکھ کی تعداد میں سماعتی خانے ہوتے ہیں، انھیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے، ہر آنکھ میں ۱۳ ملین (light receptors.) ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں، ہماری تمام جلد میں حیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً ۳۰ ہزار گرم خانے، اس کو محسوس کر کے دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں، اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں، جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے

ہیں، جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے، جسم کانپنے لگتا ہے، جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں، فوراً مزید خون ان رگوں مین دوڑ کر آتا ہے تا کہ زیادہ گرمی پہونچائی جا سکے، اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں، اور تین ملین پسینے کے غدود (glands.) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں۔

عصبی نظام کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے ایک (autonomic branch.) ہے، یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے، جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہضم، سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ، پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصے ہیں، ایک کا نام ہے مشارک نظام (sympathetic system.) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے، اور دوسرا "parasympathetic." ہے، جو روک کا کام کرتا ہے، اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں آ جائے تو، مثال کے طور پر، دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو جائے کہ موت آ جائے اور اگر بالکل دوسرے کا اختیار ہو جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے دونوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ جب دباؤ کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو "sympathetic." کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں، اسی طرح نیند کے وقت "parasympathetic" کا غلبہ ہوتا ہے، جب کہ وہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔

(مزید تفصیل کے لئے ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۵۶ء دیکھئے)

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں، اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک زبردست نظام قسم ہے جس کے سامنے انسانی مشینوں کا بہتر نظام بھی مات ہے، اور اب تو قدرت کی نقل سائنس کا ایک مستقل موضوع بن چکا ہے، اس سے پہلے سائنس کا مید اصرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ فطرت میں جو طاقتیں چھپی ہوتی ہیں ان کو

دریافت کر کے استعمال کیا جائے، مگر اب قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکانکی کو خاص اہمیت دی جارہی ہے۔

اس طرح ایک نیا علم وجود میں آیا ہے جس کو بایونکس (bionics.) کہتے ہیں، بایونکس، حیاتیاتی نظام (biological systems.) اور طریقوں کا اس غرض سے مطالعہ کرتی ہیکہ جو معلومات حاصل ہوں انھیں انجینئرنگ کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

قدرت کی نقل کرنے کی اس قسم کی مثالیں ٹکنالوجی میں پائی جاتی ہیں، مثلاً کیمرہ دراصل بنیادی طور پر آنکھ کی میکانکی کی نقل ہے کیمرے کا لنس (lens.) آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ ہے، ڈائفرم (diaphragm) پردہ شبکی (iris.) ہے اور روشنی سے متاثر ہونے والی فلم آنکھ کا پردہ ہے جس میں عکس دیکھنے کے لئے ڈورے اور مخروطی شکلیں ہوتی ہیں، ماسکو یونیورسٹی میں زیر صوتی ارتعاش (infrasonic vibrations.) معلوم کرنے اور اس کی پیائش کرنے کا ایک نمونے کا آلہ تیار کیا گیا ہے، جو طوفان کی آمد کی اطلاع ۱۲ سے ۱۵ گھنٹے پہلے تک دے دیتا ہے، یہ مروجہ آلوں سے پانچ گنا زیادہ طاقت ور ہے، اس کا خیال کس نے پیدا کیا؟ جیلی مچھلی (jelly fish.) نے انجینئروں نے اس کے اعضاء کی نقل کی جو زیر صوتی ارتعاش محسوس کرنے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ (soviet land, dec.1963.)

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، طبیعیاتی سائنس اور ٹکنالوجی درحقیقت نئے تصورات کی نقل قدرت کے زندہ نمونوں سے حاصل کرتی ہے بہت سے مسائل جو سائنس دانوں کے تخیل پر بوجھ بنے ہوئے ہیں قدرت ان کی مدتوں پہلے حل کر چکی ہے، پھر جس طرح کیمرہ اور ٹیلی پرنٹر کا ایک نظام انسانی ذہن کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اسی طرح یہ بھی نا قابل تصور ہے کہ کائنات کا

پیچیدہ ترین نظام کسی ذہن کے بغیر اپنے آپ قائم ہو، کائنات کی تنظیم قدرتی طور پر ایک انجینیر اور ایک ناظم کا تقاضا کرتی ہے، اسی کا نام خدا ہے، ہم کو جو ذہن ملا ہے وہ ناظم کے بغیر تنظیم کا تصور نہیں کرسکتا، اس لئے غیر معقول بات یہ نہیں ہے کہ ہم کائناتی تنظیم کے لئے ایک ناظم کا اقرار کریں۔ بلکہ یہ غیر معقول رویہ ہوگا کہ ہم اس تنظیم کے ناظم کا ماننے سے انکار کردیں، حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کے پاس خدا سے انکار کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔

۳۔ کائنات کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کی مانند نہیں ہے بلکہ اس کے اندر حیرت انگیز معنویت ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق وتدبیر میں کوئی ذہن کام کررہا ہے، ذہنی عمل کے بغیر کسی چیز میں ایسی معنویت پیدا نہیں ہوسکتی، محض اندھے مادی عمل سے اتفاقی طور پر وجود میں آجانے والی کائنات میں تسلسل نظم اور معنویت کے پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کائنات اس قدر حیرت انگیز طور پر موزوں اور مناسب حال ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ یہ مناسبت اور موزونیت خود بخود محض اتفاقاً واقعہ میں آگئی ہو۔۔۔ چاڈواش (chadvalih.) کے الفاظ میں:۔

''ایک شخص خواہ وہ خدا کا اقرار کرنے والا ہو یا اس کا منکر ہو، جائز طور پر اس سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ کھائے کہ اتفاق کا توازن اس کے حق میں کس طرح ہوجاتا ہے۔''

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لئے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر کھڑا ہوجائیں، اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے، زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی

حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجئے اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی مثلاً کرۂ زمین، اگر چاند اتنا چھوٹا ہوتا یعنی اس کا قطر موجود قطر کی نسبت سے 1/4 ہوتا تو اس کشش ثقل زمین کی موجودہ کش کا 1/6 رہ جاتی، کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری دنیا پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے، چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے، ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے، اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا اہم ذریعہ ہے، اور اسی بنا پر ایک سائنس داں نے اسکو عظیم توازنی پہیہ (great balance wheel.) کا نام دیا ہے، اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں کم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت بڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا، اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا، اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت دوگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دوگنی بڑھ جاتی، کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی، اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا جس کا درعمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتا، اور اگر زمین سورج کے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع

انچ تک جا پہنچتا، اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشو نما ممکن نہ رہتا، ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی ناممکن ہو جاتی کیونکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے، اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں، زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں کوئی شخص ہندوستان کی زمین پر کھڑا ہوتا امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندوستان اس کے نیچے ہو گا، پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے، ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہئے جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیئے کو تیزی سے گھما دیا جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں، زمین کے اندر غیر ضروری قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے، یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا، کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے، دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے، اس لئے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا، جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا۔۔۔ جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کرسکتا، وائٹ ہڈ (a.n.white head.) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

''نیوٹن نے یہ کہا کہ ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے، تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی، ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا، تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں، جب کہ کائنات میں کسی کا تصور نہیں کیا جا سکتا (the age of analysis,p.85)

وائٹ ہڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحب شعور کے زیر اہتمام نہیں ہے تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے، یا یوں کہئے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے، فرض کرو اسکی رفتار دوسو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے، ایسی صورت میں ہمارا دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے، گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دیگا اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا، سورج جو اس وقت ہمارے لئے زندگی کا سرچشمہ ہے اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے، یہ واقعہ ہمارے لیے حد اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے، مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب

آ جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے اور اگر موجودہ فاصلہ دوگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے، یہی صورتاس وقت پیدا ہوگی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی غیر معمولی ستارہ آ جائے مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے جسکی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے، یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم بتاتا ہے، اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قبل ہو گیا ہے، اور مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں، اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر نا قابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا!

اگر سائنس دانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ابتداء زمین کا درجہ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج ہے ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ، اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی آکسیجن اور ہائڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجہ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آ جائے، اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا، اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے یہاں تک کہ غالباً ایک ملین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی، زمین کی فضا میں جو گیسیں تھی ان کا ایک بڑا حصہ خلا میں

چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا، اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جز آکسیجن اور نائٹروجن ہے یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً لاکھواں حصہ ہے۔۔۔ کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشوونما پا سکے۔

زمین کی اوپری ہرت اگر صرف موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا، جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے، اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں اگر زمین کے اوپر کی کوئی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو چلتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں، وہ زمین کے ہر حصے پر گرتے، یہ شہابئے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ رفتار سے سفر کرتے ہیں، وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتاری آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی، مگر ہوائے کرۂ اپنی نہایت موزوں و بازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے، ہوائی کرۂ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورجکی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (actinic rays.) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہے، جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لئے ضرورت ہے، جس سے مضر بیکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فی صدی آکسیجن ہے، باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں، اس فضا سے زمین کی سطح تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے، موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہیوں میں جذب ہے، اور وہ دنیا کے تمام پانی کا 8/10 حصہ بناتا ہے، آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لئے سانس لینے کا ذریعہ ہے اور اس مقصد کے لئے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لئے ضروری تھا، مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فی صدی کے بجائے پچاس فی صدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا، اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر دس فی صدی رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی، اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں یہی دو بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے، اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی سارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں، اک عالم طبیعیات کے الفاظ میں:۔

science has no explanation to offer for the fact,and to say it is accidental is to defy mathematics(p,33)

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہہ کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایتا ہم خصوصات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (density.) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے، یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے، اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے اور دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجت تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے، اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں، اس کے بعد یونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتا ہے، اگر پانی میں یہ خاصیت ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جبکہ امریکہ میں انڈوتھیا (endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط (chestnut.) کیدرختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتریہ میں شگاف دیکھ کر کہا" یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے" امریکی شاہ بلوط کی بال دستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا، اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لئے خاص تھے، یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پُر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت (tulip trees.) اپنی نشو نما کے لئے شاید انھیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے، شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی سا جزو تھے اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے، لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں، یہ دوسرے درخت سالوں بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تہوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے، ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لئے بوئی گئی آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا، چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی، یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی، وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی کھیتوں کو ویران کر دیا اور زراعت کو ناممکن بنا دیا، کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی، ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا، بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لئے نکلے، یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا، اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا، اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا، اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پالیا اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہوگیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط وتوازن (checks and balances.) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہیں؟

کائنات میں حیرانگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پایہ جاتہ ہے یہ جامد اور بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے، اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے اس کا ایک ہی مطلب ہوگا۔ ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱.۱فیصد ہائیڈروجن اور ۸۸.۹فی صد آکسیجن، ایک سائنس دان جب تجربہ گاہ میں داخل ہوکر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش 100 درجہ سینٹی گریڈ ہے، جب تک ہوا کا دباؤ (atmospheric pressure.) ۷۶۰ ایم ایم رہے، اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لئے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے، اس طرح نقطۂ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا، یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جاسکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے، اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لئے کوئی بنیاد نہ ہوتی کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعیات کے لئے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریق عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نووارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ عناصر ہیں نظم اور دوریت ہے، سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (mendeleev.) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ (periodic chart.) کہا جاتا ہے، اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے، اس لئے اس کے نقشے میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے، جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پورے ہوگئے ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کئے

جاتے ہیں، جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں (protons.) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے، یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے، ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے۔ ہیلیم میں میں دو اور لیتھیم میں تین، مختلف ایٹم کی جدول تیار کرنا اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے، نظم وترتیب کی اسسے مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱۰۱ کی شناخت محض اس کے ۱۷ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی، قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (periodic law.) کہتے ہیں، مگر نقشہ اور ضابطہ و یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اکا انکار کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی

'' ۱۱ اگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (cornwall.) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا''۔۔۔۔ یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے،، جب ہم آسمان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم لا تعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، ان گنت صدیوں سے اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک فقدان المثال نظم وضبط پایا جاتا ہے، ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہہ کرتا ہے، اس کے نتیجے

میں (A.C. adams.) اور لاویرے (u.lelerrier.) کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کر سکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا، چنانچہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے، جس کو ہم اب نیپچون (neptune.) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر نا قابل قیاس بات ہیکہ کہ کائنات میں ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہو

کائنات کی حکمت و معنویت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایسے امکانات رکھے گئے ہیں کہ انسان بوقت ضرورت تصرف کرکے اس کو اپنے لئے استعمال کر سکے، مثال کے طور پر نائٹروجن کے مسئلے کو لیجئے ہوا کے ہر جھونکے میں نائٹروجن ۷۸ فی صد ہوتا ہے، اس کے علاوہ بہتسے کیمیائی اجزاء ہیں جن میں جائٹروجن شامل ہوتا ہے، ان کو ہم مرکب نائٹروجن کہہ سکتے ہیں، یہی وہ نائٹروجن ہے، جس کو پودے استعمال کرتے ہیں، اور جن سے ہماری غذا کا نائٹروجنی حصہ تیار ہوتا، اگر یہ نہ ہوتو انسان اور جانور بھوکوں مر جائیں۔

صرف دو طریقے، جن سے قابل تحلیل نائٹروجن مٹی میں مل کر کھاد بنتا ہے، اگر یہ نائٹروجن مٹی میں شامل نہ ہوتو کوئی بھی غذائی پودا نہ اُگے، ایک طریقہ جس سے یہ نائٹروجن مٹی میں شامل ہوتا ہے وہ مخصوص بیکٹیریائی عمل ہے، یہ بیکٹیریا والے پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں اور ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کو مرکب نائٹروجن کی شکل دیتے رہتے ہیں، ، پودا جب سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے تو اس مرکب کا کچھ حصہ زمین میں رہ جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جس سے مٹی کو نائٹروجن ملتا ہے، وہ بجلی کا کڑکا ہے، ہر بار جب بجلی

کی رو فضا میں گزرتی ہے تو وہ تھوڑے سے آکسیجن کو نائٹروجن کے ساتھ ملکب کر دیتی ہے جو کہ بارش کے ذریعہ ہمارے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے، اس طرح سے جو نائٹریٹ نائٹروجن آسانی سے مل جاتا ہے، اس کا اندازہ سالانہ ایک ایکٹر زمین میں پانچ پونڈ ہے جو کہ تیس پونڈ سوڈیم نائٹریٹ کے برابر ہے۔

یہ دونوں طریقے بحر حال ناکافی تھے، اور وجہ ہے کہ وہ کھیت جن میں عرصہ دراز تک کھیتی ہوتی رہتی ہے، ان کا نائٹروجن ختم ہو جاتا ہے، اور اسی لئے کاش کار فصلوں کا الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں، یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ایسے مرحلے میں جب کہ اضافہ آبادی اور کثرت کاشت کی وجہ سے مرکب نائٹروجن کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی، اور انسان کو مستقبل میں قحط کے آثار نظر آنے لگے تھے اور یہ صرف اس صدی کے آغاز کی بات ہے کہ عین اس وقت وہ طریقہ دریافت ہو گیا جس سے ہوا کے ذریعہ مصنوعی طور پر مرکب نائٹروجن بنایا جا سکتا ہے، مرکب نائٹروجن بنانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ فضا میں مصنوعی طور پر بجلی کا کڑکا پیدا کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ہوا میں بجلی کی چمک پیدا کرنے کے لئے تقریباً تین لاکھ ہارس پارہ کی قوت استعمال کی گئی اور جیسا کہ پہلے سے اندازہ کیا جا چکا تھا، ایک قلیل مقدار نائٹروجن کی تیار ہو گئی، مگر اب انسانی خداداد عقل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انسانی تاریخ کے دس ہزار سال بعد ایسے طریقے کر لئے گئے ہیں، جن سے وہ اس گیس کو کھاد میں تبدیل کر سکتا ہے، اس کے بعد انسان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی غذا کے اس لازمی جز کو تیار کر سکے جس کے بغیر وہ بھوکوں مر جاتا، یہ نہایت عجیب ''حسن اتفاق'' ہے کہ زمین کی تاریخ میں پہلی بار عین وقت پر انسان نے قلت خوراک کا حل دریافت کر لیا، یہ المیہ ٹھیک اس وقت رفع ہو گیا جن کہ اس کے واقع ہونے کا امکان تھا۔

کائنات میں اس طرح کی حکمت و معنویت کے بے شمار پہلو ہیں، ہماری تمام

سائنسوں نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ہم نے معلوم کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہے وہ چیز جس کو معلوم کرنا ابھی باقی ہے، تاہم جو کچھ انسان معلوم کر چکا ہے، وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ اس کے صرف عنوانات دینے کے لئے موجودہ کتاب سے بہت زیادہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی، اور پھر بھی کچھ عنوانات بچ رہے گے، انسان کی زبان سے آلاء رب اور آیات الٰہی کا ہر اظہار ہے، اس کی جتنی بھی تفصیل کی جائے، جہاں زبان وقلم رکیں گے وہاں یہ احساس ضرور موجود ہوگا کہ ہم نے ''بیان'' نہیں کیا بلکہ اس کی ''تحدید'' کردی، حقیقت یہ ہے کہ اگر سارے علوم منکشف ہو جائیں، اور اس کے بعد سارے انسان اس طرح لکھنے بیٹھ جائیں کہ دنیا کے تمام وسائل ان کے لئے مساعد ہوں، جب بھی کائنات کی حکمتوں کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔

ولو ان ما فی الرض من شجرۃ اقلا م والبحر یمدوہُ من بعدہ سبعۃ البحر مانفدت کلمات اللہ (لقمان۔ ۲۷)

ترجمہ:۔ اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ سمندروں کے ساتھ سات اور سمندر ان کی سیاہی کا کام دیں، جب بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جس نے بھی کائنات کا مطالعہ کیا ہے، وہ بلاشبہ اعتراف کرے گا کہ کتاب الٰہی کے ان الفاظ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، وہ صرف ایک موجودہ حقیقت کا سادہ سا اظہار ہے۔

پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت و معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی دوسری توجیہہ کرتے ہیں، اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر کا اشارہ نہیں ملتا، بلکہ یہ سب کچھ محض ''اتفاق'' سے ہوگیا ہے، ٹی۔ ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر

ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہیکہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شکسپیر کی ایک نظم (sonnet.) نکل آئے، اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ اندھا دھند گردش کے کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی ہے۔

(the mysterious universe,p.3-4.)

یہ بات اگر چہ بجائے خود بالکل لغو ہے، کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام معلوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے، بالاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں، مثلاً ہوا کا جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (pollen.) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور استثنائی واقعہ کی توجیہہ کرتا ہے، وہ گلاب کے پورے وجود کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جاسکتا ''اتفاقی واقعہ'' کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باجود کائنات کی توجیہہ کے اعتبار سے وہ لغو بات ہے، پروفیسر ایڈون (edwin conklin) کے الفاظ میں ''زندگی کا بذریعہ حادثہ (accident.) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا۔''

(the avidence of god,p.174.)

کہا جاتا ہے کہ اتفاق کے حوالے سے کائنات کی توجیہہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سر جیمز کے الفاظ میں دو خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (purely mathematical laws of chance.) پر مبنی ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

''اتفاق'' (chance.) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے، جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہیجن میں قطعی معلومات ممکن

نہیں ہوتیں، اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں با آسانی امتیاز کر سکتے ہیں، اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔"

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہو گیا، اور پھر یہ بھی فرض کرلیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہوگیا، اگر چہ ان مفروضیات کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔۔۔ جن بھی کائنات کی توجیہ حاصل نہیں ہوتی۔۔ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذاہب کی راہ میں حائل ہوگیا ہے، بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانون اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کر رہی ہے کہ قانون اتفاق، موجودہ کائنات کا خالق ہوسکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے، ورعمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے، وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔"

اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس نشان لگا دو، اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو، اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو۔۔۔ یہ امکان کہ نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک دو تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہیں، یہ امکان کہ ایک دو تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں دس ہزار میں ایک ہیں، یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے۔"

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کہ کریسی مارلسن (a.cressy morrlson) لکھتا ہے:۔

the object in dealing with so simple a problem is to show how enormously figures multiply against chance.,,

(man does not stand alone,p.17.)

یعنی یہ سادہ مثال اس لئے دی گئی تا کہ یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ اتفاق سے ہو گیا، تو اس کے لئے کتنی مدت درکار ہو گی، ذی حیات اشیاء کی کی ترکیب زندہ خلیوں (living cells) سے ہوتی ہے، خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم الخلیہ (cytoligy.) میں کیا جاتا ہے، ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں، ان میں سے ایک پروٹین ہے، پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔۔۔ کاربن، ہائیڈروجن نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پروٹینی (molecule.) ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جواہر (atoms) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آ جائے، مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو، اور وہ مدت کے جس اندر اس کام کو تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

سوئیزرلینڈ کے ایک ریاض داں پروفیسر چارلس ایوین گائی (charles eugene huye.) نے اس کا حساب لگایا ہے، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح

کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 120/10 کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہوسکتا ہے (120/10) کا مطلب یہ ہیکہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے، دوسرے لفظوں میں دس کے آگے ایک سو ساٹھ صفر، ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے پوری کائنات کے موجدہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جیسے یکجا کر کے ہلایا جائے، اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان 243/10 سال بعد ہے۔

پروٹین، امینو ایسڈ (amino acids.) کے ملبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں، اگر یہ غلط شکل میں یک جا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتےہیں، پروفیسر جے، بی، لیتھیز (j.b.leathes.) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں 48/10 طریقے سے یک جا کیا جا سکتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لئے اتفاق سے یک جا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے، ایسا ہو جائے، دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے بوجود کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ ظہور میں آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی پروٹین کے خلیے کا جز بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی، اس کا جواب اس توجیہہ میں نہیں ہے، پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزو پروٹین ۔۔۔ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہہ ہے، جب کہ

صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہا سنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کمٹے ڈونوائے (le comte du nouy.) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لئے جس وقت جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے اندازوں سے نا قابل یقین حد تک زیادہ ہے، اس کے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی 82/10 سال نور (دس کے آگے ۸۲ صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو، یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہنچ جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے، وہ اس عمل کیلئے قطعاً نا کافی ہے، پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو ٹریلین حرکت فی سکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے، اور اس سارے عمل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے وہ 243/10 (دس کے آگے ۲۴۳ صفر) بلین سال ہے مگر ''ہمیں بھولنا نہیں چاہئے'' ڈونوائے لکھتا ہے ''کہ زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جب کہ زمین ٹھنڈی ہوئی۔''

(human destiny,p.30-36.)

سائنس نے اگر چہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے نا کافی ہے، مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری زندگی پیدا ہوئی اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کر لی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے، جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا، اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم شعلہ تھی، جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا سوال نہیں تھا، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی، اس انجماد ہی کے بعد یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (radio -active elements.) کی دریافت سے ہوا ہے، تاب کار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں، اور اسی لئے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں، اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتہ رہتی ہے، اور وہ دھیرے دھیرے غیر تاب کار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں یورینیم اسی قسم کا ایک تاب کار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی، ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں، یورینیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں پر پائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں، جب کہ یہ چٹان منجمد ہوئی یورینیم کیساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورینیم کے ساتھ پایا جاتا ہے، وہ یورینیم کے انتشار (disintegration of uranium.) سے وجود میں آیا ہے، کیونکہ یورینیم سے بنا ہوا سیسہ عام سیسے سے ہلکا ہوتا ہے اس لئے سیسہ کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورینیم سے بنا ہے یا نہیں، اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورینیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے، اور چونکہ یورینیم چٹان میں اس وقت سے ہے جب

کہ وہ چٹان منجمد ہوئی، اس لئے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں، یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قریب ترین چٹانیں ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو، مگر ارضیاتی مشاہدہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ جے، ڈبلیو، این، سولیون نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے، ابظاہر ہے کہ جب صرف ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے سنکھ مہا سنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آ گئیں اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیاء سے اتنی قلیل مدت سے انسان جیسی اعلیٰ مخلوق اتفاقاً کیسے وجود میں آ گئی جب کہ نظریہ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے، ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ہامر ریاضی پاچو (patau.) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے، اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض ارتقا کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جد امجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہے تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی کریڈر (martin broks kreider.) کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں۔

the mathematical probability of a chance occurence

of all the necessary factors in the right proportion is almost nil.

(the evidence of god,p.67.)

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کیساتھ اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریہ کے لغویت واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''اتفاق'' سے نہ کوئی ایٹم یا مالے کیول وجود میں آ سکتا ہے، اور نہ وہ ذہن پیدا ہوسکتا ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے، یہ نظریہ نا صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے، بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ ایسی ہی لغو بات ہے جیسے کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہوسکتا ہے، ایسے شخص کے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لئے فرش کشش ارضی، پانی اور گلاس کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (haeckel.) نے کہا تھا، ''مجھے ہوا پانی کیمیائی اجزا یا وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا،'' مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لئے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کہ وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہے، بہت خوب کہا ماریسن نے:

> ''ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین اور خود زندگی کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا، انسان کو وجود میں لانے کے لئے اس کو سب سے پہلے نا قابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہوگا، اور اس کو زندگی دینی ہوگی، پھر بھی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروڑوں میں ایک کا ہے، اور بالفرض اگر وہ

کامیاب بھی ہو جائے تو اسکو وہ اتفاق (accident.) نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (intelligence.) کا ایک نتیجہ قرار دے گا۔"

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس (earl dawis.) کے الفاظ پر ختم کروں گا

"اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے، اس طرح اگر چہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے، لیکن وہ نرالہ خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقید ہے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے، اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزو نہیں بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے۔"

the evidenceof god,p71.

.....

فٹ نوٹ:۔

صفحہ نمبر ۶۱ یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئن سٹائن کا نظریہ ہے، مگر یہ صرف ایک ریاضی داں کا قیاس ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت سمجھ نہیں سکا ہے۔

صفحہ نمبر ۶۷:۔ کوئی ذی ہوش یہ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا کہ کیمرہ اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا ہے، مگر اس کے باوجود دنیا کے بہت سے ہوش مند یہ یقین رکھتے ہیں کہ "آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے۔"

صفحہ نمبر ۶۸:۔ the evidence of hod ,p.88.

صفحہ نمبر۶۹:۔the evidence of god

صفحہ نمبر ۷۸:۔lyon bockman and brady--the nature and properties of soilsal

صفحہ نمبر۸۱:۔the evidence of god ,p.23(2)

mysterious universe,p.3.(1)

صفحہ نمبر۸۶:۔

limitations of science,p.78.(1)

the evidence of god p,117(2.)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

دلیل آخرت

مذہب جن حقیقتوں کو ماننے کی ہمیں دعوت دیتا ہے، ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت ۔۔ آخرت کا تصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موجدہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے، جہاں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے موجودہ دنیا انسان کی امتحان گاہ ہے، یہاں ایک خاص عرصہ کے لئے انسان کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب اس کا مالک اسے توڑ کر دوسری دنیا دوسرے ڈھنگ پر بنائے گا، وہاں تمام انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، ہر ایک نے موجودہ دنیا میں جو اچھے یا برے عمل کئے ہیں، وہ تمام وہاں خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دی جائے گی۔

یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اس کو جانچنے کے لئے ہم اس پر چند پہلوؤں سے غور کریں گے۔

امکان :۔

پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کے موجودہ نظام میں کیا اس طرح کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نظر آتا ہے کیا یہاں کچھ ایسے واقعات و اشارے پائے جاتے ہیں، جو اس دعوے کی تصدیق کر رہے ہوں۔

یہ نظریہ سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ انسان اور کائنات اپنی موجودہ شکل میں ابدی نہ ہوں اور یہ دونوں چیزیں ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق بالکل یقینی ہیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں انسان کے لئے بھی موت، دونوں میں سے کوئی بھی موت کے خطرے سے خالی نہیں جو لوگ دوسری دنیا کو نہیں مانتے وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اسی دنیا کو اپنی ابدی خشیوں کی دنیا بنائیں، انھوں نے اس بات کی بہت تحقیق کی کہ موت کیوں آتی ہے تا کہ اس کے اسباب کو روک کر زندگی

کو جاوداں بنایا جا سکے، مگر انھیں اس سلسلے میں قطعی ناکامی ہوئی۔۔۔ ہر مطالعہ نے بالآخر یہی بتایا کہ موت یقینی ہے، اس سے چھٹکارا نہیں۔

''موت کیوں آتی ہے''۔۔ اس کے تقریباً دوسو جوابات دیئے گئے ہیں، جسم ناکارہ ہو جاتا ہے، اجزائے ترکیبی صرف ہو چکتے ہیں، رگیں پتھرا جاتی ہیں، متحرک البومن کی جگہ کم متحرک البومن آ جاتے ہیں، مربوط گرنے والے نسیج بیکار ہو جاتے ہیں، جسم میں آستو کے بیکٹیریا کا زہر دوڑ جاتا ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

جسم کے ناکارہ ہونے کی بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ، مشینیں، جوتے، کپڑے، سبھی ایک خاص مدت کے بعد ناکارہ ہو جاتے ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ پوستین کی طرح ہمارا جسم بھی، جلد یا مدبر پرانا ہو کر ختم ہو جاتا ہو، مگر سائنس اس کی تائید نہیں کرتی، اور سائنسی تشریح کے مطابق جسم انسانی نہ پوستین کی طرح ہوتا ہے، نہ مشین سے ملتا جلتا ہے، اور نہ چٹان سے مشابہ ہے، اگر اسے تشبیہہ دی جاسکتی ہے تو دریا سے جو ہزار سال پہلے بھی بہا کرتا تھا اور آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا پرانا ہوتا ہے یا ناکارہ ہوتا ہے، اسی بنیاد پر کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر لنس پالنگ نے کہا ہے کہ نظریاتی طور پر انسان بڑی حد تک لافانی ہے، اس کے جسم کے خلیے اسی مشین ہیں، جو خود بخود اپنی خرابی دور کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود انسان بوڑھا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔۔۔ اس کے اسباب اب تک راز بنے ہوئے ہیں۔

ہماری زندگی کی مسلسل تجدید ہوتی رہتی ہے، ہمارے خلیوں میں البومن کے سالمے بنت اور تلف ہوتے اور پھر بنتے رہتے ہیں، خلیے بھی (سوائے اعصابی خلیوں کے) برابر تلف ہوتے اور ان کی جگہ نئے بنتے رہتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ کوئی چار مہینے کے عرصے میں انسان ک خون بالکل ہی نیا ہو جاتا ہے، اور چند

سال کے عرصہ میں انسنی جسم کے تمام ایٹم پوری طرح بدل جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نوعیت ایک ڈھانچے کی نہیں بلکہ دریا کی سی ہے، یعنی وہ ایک عمل ہے، ایسی حالت میں جسم کے پرانے اور ناکارہ ہونے کے تمام نظریے بے بنیاد ہو جاتیہیں، وہ تمام چیزیں جو زندگی کے ابتدائی برسوں میں خرابہو گئی تھیں، زہر آلود اور بے کار ہو چکی تھیں، وہ جسم سے کب کی خارج ہو چکیں، پھر ان کو موت کا سبب قرار دینا کیا معنی ۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا سبب آنتوں اور رگوں اور دل میں نہیں، بلکہ اس کا سبب کہیں اور ہے۔

ایک سبب یہ ہے کہ اعصابی خلیے زندگی بھر وہی رہتے ہیں یہ کبھی نہیں بدلتے، چنانچہ انسان کے اندر اعصابی خلیے سال بہ سال کم ہوتے جاتے ہیں، اور مجموعی طور پر اعصابی نظام کمزور ہوتا جاتا ہے، اگر یہ توجیہہ صحیح ہے، اور اعصابی نظام ہی نظام جسمانی کا کمزور حصہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظام جسمانی سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہئے جن میں اعصابی نظام ہوتا ہی نہیں۔

مگر مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، درخت میں اعصابی نظام نہیں ہوتا اور وہ سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہتا ہے، مگر گیہوں میں بھی اعصاب نہں ہوتے مگر وہ صرف سال بھر زندہ رہتا ہے، اور اسی طرح ایمبا کیڑے میں بھی اعصاب نہیں ہوتے لیکن وہ صرف آدھ گھنٹہ زندہ رہتا ہے، اسی طرح اس توجیہہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ نسل کے حیوانات کی عمر جن کا اعصابی نظام مکمل ترین ہوتا ہے، سب سے زیادہ ہونی چاہئے، مگر ایسا نہیں ہے، مگر مچھ، کچھوا، پاٹک مچھلی سب سے لمبی عمر پاتے ہیں۔

اسی طرح موت کو غیر یقینی بنانے کے لئے اس کے اسباب کی جتنی چھان بین کی گئی ہے وہ سب ناکامی پر ختم ہوئی ہے اور یہ امکان اب بھی بدستور باقی ہے کہ سارے انسانوں کو ایک مقررہ مدت پر مرنا ہے، اور ایسا کوئی امکان اب تک ثابت

نہ ہو سکا کہ موت نہیں آئے گی، ڈاکٹر الکسس کیرل نے اسی مسئلہ پر زمان داخلی (in ward time.) کے عنوان سے لمبی بحث کی ہے، اور اس سلسلے کی کوششوں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا، مگر اس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے، وہ عضویاتی زمان (physiological time.) کو روکنے اور غالباً ایک حد تک اسکو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن وہ موت پر کبھی فتح نہیں پاسکتا۔''

(man the unknown,p.175.)

اسی طرح نظام کائنات کی موجودہ شکل کا درہم برہم ہونا بھی ایک ایسی چیز ہے، جو بالکل واقعاتی طور پر سمجھ میں آتی ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کائنات میں ہم جن چھوٹی چھوٹی قیامتوں کے عالمی پیمانے پر واقع ہونے کی پیشین گوئی ہے

سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے، وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے، یہ مادہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑ گڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے، اور کش مکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ اسی کا نام زلزلہ ہے یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لئے سب سے زیادہ خوف ناک لفظ ہے، یہ انسان کے اوپر قدرت ک ایک حملہ ہے جس میں فیصلے کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، زلزلے کے بارے میں انسان بالکل بے بس ہے یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں، جس سے صرف ۵۰ کیلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلے میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا، ایک جغرافیہ داں کے الفاظ میں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک

قدرتی جہنم (physical hell.) دہک رہا ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کیا وپر کھڑے ہیں، جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظام ارضی کو درہم برہم کرسکتا ہے۔

(George gamow, biography of the earth,p.82.)

یہ زلزلے دنیا کے تقریباً ہر حصے میں اور ہر روز آتے ہیں، لیکن جغرافیائی اعتبار سے وہ زیادہ تعداد میں وہاں محسوس ہوتے ہیں، جہاں آتش فشاں پہاڑ ہیں، سب سے قدیم کن زلزلہ جس سے تاریخ واقف ہے، وہ چین کے صوبہ شنسی (shensi.) کا زلزلہ ہے، جو ۱۵۵۶ء میں آیا تھا، اس زلزلے میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشخاص ہلاک ہو گئے، اسی طرح یکم نومبر ۱۷۵۵ء کو پرتگال میں زلزلہ آیا جس نے لزبن (lisbon.) کا پورا شہر تباہ کر دیا، اس زلزلے میں چھ منٹ کے اندر تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، تمام عمارتیں مسمار ہو گئیں، اندازہ کیا گیا ہے، کہ اس زلزلے میں یورپ کے رقبہ کا چوگنا حصہ ہل گیا تھا، اسی نوعیت کا ایک شدید زلزلہ ۱۸۹۷ء میں آسام میں آیا تھا، جو دنیا کے پانچ انتہائی زلزلوں میں شمار ہوتا ہے، اس سے شمالی آسام میں ہول ناک تباہی آئی تھی، اس زلزلے نے دریائے برہم پتر کا رخ موڑ دیا تھا اور ایورسٹ کی چوٹی ابھر کر سو فٹ اوپر چلی گئی۔

زلزلہ دراصل، جب پختہ مکانات تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح گرنے لگتے ہیں، جب زمین کا اوپری حصہ دھنس جاتا ہے، اور اندرونی حصہ اوپر آجاتا ہے، جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں، جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں۔۔۔ یہ زلزلے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلے میں کس قدر بے بس ہے، یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا، یہ زلزلے گویا اچانک آنے

والی قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں، یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا مالک کس طرح کے موجودہ نظام کو توڑنے پر پوری طرح قادر ہے۔ یہی حال بیرونی کائنات کا ہے، کائنات نام ہے ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے آلاؤ (ستارے) بے شمار اندھا دھند گردش کر رہے ہیں، جیسے بے شمار لٹو کسی فرش پر ہماری تمام تر تیز رفتار سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۷۹) یہ گردش کسی بھی وقت زبردست باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکرا کیوں نہیں جاتے، علم الافلاک کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ ستاروں کا باہم ٹکرا جانا ممکن ہے چنانچہ شمسی نظام کے وجود میں آنے کی ایک تو جیہہ اسی قسم کے ٹکراؤ پر کی گئی ہے، اس ٹکراؤ کو اگر ہم بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں، تو ہم نہایت آسانی سے زیر بحث امکان کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ دراصل اسی واقعہ کا دوسرا نام قیامت ہے، نظریہ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہو جائے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے۔۔۔ قیامت کا آنا ہمارے لئے ایک معلوم حقیقت ہے۔۔۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حد تک جانتے ہیں۔۔۔ اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے۔

آخرت کے امکان کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ ہے، ''کیا مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے'' موجودہ ذہن اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔۔۔ ''نہیں مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں'' کیونکہ ہم جس زندگی سے واقف ہیں وہ مادی عناصر کی ایک خاص ترتیب در پائی جا سکتی ہے، موت کے بعد یہ ترتیب باقی نہیں رہتی، اس لئے موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہو سکتی۔''

ٹی، آر، مائلز (T.R.miles.) بعثت بعد الموت کو محض ایک تمثیلی حقیقت قرار دیتا ہے، اور اس کو ایک لفظی حقیقت (Literaltruth.) کے طور پر ماننے سے انکار کرتا ہے ''میرے نزدیک'' وہ کہتا ہے ''یہ ایک مضبوط مقدمہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی زندہ رہتا ہے، یہ بالکل لفظی طور پر ایک حقیقت ہوسکتی ہے، اور اس قابل ہے کہ تجربے سیاس کا غلط یا صحیح ہونا معلوم کیا جا سکے، مشکل صرف یہ ہے کہ جب تک ہم کو موت نہ آئے، اس کا قطعی جواب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، مگر یہ قیاس کرنا ممکن ہے۔'' اب چونکہ قیاس اس کے خلاف ہے، اس لئے اس کے نزدیک یہ لفظی حقیقت نہیں، وہ قیاس یہ ہے:۔

> ''علم الاعصاب (neurology.) کے مطابق خارجی دنیا اور اس سے تعلقات کا علم صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ انسانی دماغ معمول کے مطابق کام کر رہا ہو اور موت کے بعد جب کہ دماغ کی تنظیم منتشر ہو جاتی ہے، اس قسم کا ادراک (awareness.) نا ممکن ہے۔''

مگر اس سے زیادہ قوی قیاسات دوسرے موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جسم کے ذرات مادی کا انتشار زندگی کو ختم نہیں کرتا، زندگی ایک الگ اور مستقل بالذات چیز ہے، جو ذرات کی تبدیلی کے باوجود باقی رہتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا جسم بعض قسم کے اجزا سے مل کر بنا ہے جس کی مجموعی اکائی کو خلیہ (cell.) کہتے ہیں، یہ خلیے نہایت پیچیدہ ساخت کے چھوٹے چھوٹے ریزے ہیں جن کی تعداد ایک متوسط قد کے انسان میں تقریباً ۲۶ پدم ہوتی ہے، یہ گویا بے شمار چھوٹی چھوٹی اینٹیں ہیں جن کے ذریعہ ہمارے جسم کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، فرق یہ ہے کہ عمارت کی اینٹیں پوری زندگی بھر وہی کی وہی رہتی ہیں، جو شروع میں اس کے اندر لگائی گئی تھیں، مگر جسم کی اینٹیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں جس طرح ہر

چلنے والی مشین کے اندر گھساؤ (depreciation.) کا عمل ہوتا ہے، اسی طرح ہماری جسمانی مشین بھی گھستی ہے، اور اس کی ''اینٹیں'' مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر کم ہوتی رہتی ہیں، یہ کمی غذا سے پوری ہوتی ہے، غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم کے لئے وہ تمام اینٹیں مہیا کرتی ہے، جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہمارے جسم کو درکار ہوتی ہیں گویا جسم نام ہے خلیوں کے ایک ایسے مرکب کا جو ہر آن اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہو، اس کی مثال بہتے ہوئے دریا کے ایک گھاٹ کی ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے مگر ہر وقت وہی پانی نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہر آن ہمارے جسم میں ایک تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے، جب جسم کی پچھلی تمام اینٹیں ٹوٹ کر نکل جاتی ہیں، اور اسکی جگہ مکمل طور پر نئی اینٹیں لے لیتی ہیں، بچے کے جسم میں یہ عمل جلد جلد ہوتا ہے اور، عمر کے بڑھنے سے اس کی رفتار سست ہوتی رہتی ہے، اگر پوری عمر کا اوسط لگایا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دس سال میں جسم کے اندر یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے، ظاہری جسم کے خاتمے کا برابر ہوتا رہتا ہے، مگر اندر کا انسان اسی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے، اس کا علم، اس کا حافظہ اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں اس کے تمام خیالات بدستور باقی رہتے ہیں، وہ اپنی عمر کے ہر مرحلے میں اپنے آپ کو وہی سابق ''انسان'' محسوس کرتا ہے، جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں غرض ناخن سے بال تک ہر چیز بدل چکی ہوتی ہے۔

اب اگر جسم کے خاتمے کے ساتھ اس جسم کا انسان بھی مر جاتا ہو تو خلیوں کی تبدیلی سے اسے بھی متاثر ہونا چاہیے، مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان یا انسانی زندگی جسم سے الگ کوئی چیز ہے جو جسم کی تبدیلی اور موت کے باوجود اپنا وجود باقی رکھتی ہے، وہ ایک گھاٹ ہے جس کی گہرائی میں اجسام یا دوسرے الفاظ میں خلیوں کی ایک مسلسل آمد و رفت جاری ہے، چنانچہ ایک

سائنس داں نے حیات یا انسانی ہستی کو ایک ایسی مستقل بالذات قرار دیا ہے، جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے۔۔ اس کے الفاظ میں:۔

personality is changelessness in change.

اگر موت محض جسم کے خاتمے کا نام ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے ہر عمل کی تکمیل کے بعد گویا انسان ایک بار مر گیا، اب اگر ہم اس کو دیکھتے ہیں تو یہ دراصل اس کی دوسری زندگی ہے جو اس نے مر کر حاصل کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس سال کی عمر کا ایک زندہ شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ اپنی اس مختصر سی زندگی میں کم از کم پانچ بار مر چکا ہے، پانچ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو چھٹی بار کی موت کے بارے میں آخر کیوں یقین کر لیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً مر جائے گا، اس کے بعد اس کے لئے زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

بعض لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کریں گے وہ کہیں گے کہ وہ ذہن یا اندرونی وجود جس کو تم انسان کہتے ہو، وہ دراصل کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے بلکہ خارجی دنیا کے ساتھ جسم کے تعلق سے پیدا ہوا ہے، تمام جذبات و خیالات مادی عمل کے دوران میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح دھات کے دو ٹکڑوں کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے، جدید فلسفہ وجود کا انتہائی مخالف ہے جیمز کہتا ہے، کہ شعور ایک ہستی (entity.) کے طور پر موجود نہیں ہے بلکہ ایک عمل (function.) کے طور پر موجود ہے، وہ ایک کاروائی (process.) ہے، ہمارے زمانے کے فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد نے اصرار کیا ہے کہ شعور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خارج سے پیدا ہونے والے ایک ہیجان کا عصبی جواب (nervous response.) ہے، اس تصور کے مطابق موت یعنی جسمانی نظام کے منتشر ہونے کے بعد انسان کی موجودگی کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ وہ مرکز اعصاب ہی اس کے بعد باقی نہیں رہا، جو خارجی دنیا

کے تعامل سے زندگی کا جواب ظاہر کرے نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی بعد موت کا تصور بالکل غیر عقلی تصور ہے۔۔۔اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

میں کہوگا کہ انسان کی حقیقت اگر یہی ہے تو یقیناً ہامرے لئے ممکن ہونا چاہیے کہ ہم ایک زندہ اور باشعور انسان کو پیدا کرسکیں، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ انسان کا جسم کن عناصر سے مل کر بنتا ہے، یہ تمام عناصر بہت کثیر مقدار میں زمین کے اندر اور اسکی فضا میں قابل حصول حالت میں موجود ہیں ہم نے جسم کے ہم نے جسم کے اندرونی نظام کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ معلوم کرلیا ہے، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ انسانی جسم کا ڈھانچہ اور اس کے رگ وریشے کس طرح بنائے گئے ہیں، پھر ہمارے پاس ایسے بے شمار ماہر آرٹسٹ موجود ہیں، جو کمال درجہ مطابقت کے ساتھ انسان کی مانند ایک جسم بنا کر کھڑا کردیں، مخالفین روح کو اگر اپنے نظریے پر یقین ہے تو وہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بہت سے انسانی جسم تیار کر کے زمین کے مختلف حصوں میں کھڑا کردیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب خارجی دنیا کے اثرات پڑنے سے یہ ڈھانچے چلنے اور بولنے لگیں گے۔

یہ زندگی کے باقی رہنے کے امکان کی بحث تھی، اب اس مقصد کے اعتبار سے غور کیجئے جس کے لئے مذہب دوسری زندگی کے اوپر عقیدہ رکھتا ہے ہمارے تصور کے مطابق زندگی کا بقا شیشے کی ''آمد ورفت'' کا نام نہیں ہے جو شیشہ ساعت (sand glass.) کی طرح بس خالی اور پر ہوتا رہے، اس سے آگے اس کا، اس سے آگے اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو۔۔۔ بلکہ دوسری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ زندگیوں کی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ دیا جائے گا۔

عقیدہ آخرت کا یہ جزو بھی اس وقت بالکل ممکن نظر آنے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں حیرت انگیز طور پر ہر شخص کا نامہ اعمال رات دن ایک لمحہ کے وقفہ کے بغیر ضبط (record.) کیا جارہا ہے آدمی تین شکلوں میں اپنی ہستی کو

ظاہر کرتا ہے۔ ۔ ۔نیت،قول، اورعمل، یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر محفوظ کی جا رہی ہیں ہمارا یہ خیال ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہماری تمام کاروائیاں کائنات کے پردہ پر اس طرح نقش ہو رہی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جا سکے، اور یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا کی زندگی میں کس نے کیا کہا، کس کی زندگی شر کی زندگی تھی اور کس کی زندگی خیر کی زندگی۔

جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں، ہم بہت جلد انھیں بھول جاتے ہیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے، مگر جب ہم مدتوں کی ایک بھولی ہوئی بات کو خواب میں دیکھتے ہیں یا ذہنی اختلال کے بعد آدمی ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کے فراموش شدہ ماضی سے متعلق ہیں، تو یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کا حافظہ اتنا ہی نہیں ہے، جتنا شعوری طور پر وہ محسوس کرتا ہے، حافظہ کے کچھ خانے ایسے بھی ہیں، جو بظاہر شعور کی گرفت میں نہیں رہتے، مگر وہ موجود ہوتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے تجربوں سے ثابت ہوا کہ ہمارے تمام خیالات قل طور پر اپنی پوری شکل میں محفوظ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ہم چاہیں بھی تو انھیں محو نہیں کر سکتے، یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی شخصیت صرف وہی نہیں ہے، جیسے ہم شعور کہتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس نفس انسانی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے کے نیچے موجود رہتا ہے، یہ حصہ جسے فرائڈ تحت شعور (sub-conscious.) یا لاشعور (unconscious.) کا نام دیتا ہے، یہ ہماری شخصیت کا بہت بڑا حصہ ہے، نفس انسانی کی مثال سمندر میں تیرتے ہوئے تودۂ برف (ice berg.) کی سی ہے، جس کا صرف نواں حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے، اور بقیہ آٹھ حصے سمندر کے نیچے رہتے ہیں، یہی تحت شعور ہے جو ہمارے تمام خیالات اور ہماری نیتوں کو محفوظ رکھتا ہے، فرائڈ اپنے اکتیسویں لیکچر میں کہتا ہے:۔

"منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور (id) کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہے۔۔۔لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہو کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور فاصلے کے درمیان واقع ہوتے ہیں لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو، لاشعور میں وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے، جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایسے خیالات (conative impulses.) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر قانونی ہوتے ہیں اور دسیوں سال تک اس طرح محفوظ رہتے ہیں، گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔

(New introductory lectures on paycho-analysis,(london,1949)p.99.)

تحت شعور کا یہ نظریہ اب نفسیات میں عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بات جو آدمی سوچتا ہے، اور ہر اچھا یا برا خیال جو اس کے دل میں گزرتا ہے، وہ سب کا سب نفس انسانی میں اس طرح نقش ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی نہیں مٹتا، وقت کا گزرنا یا حالات کا بدلنا اس کے اندر ذرہ برابر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔۔۔یہ واقعہ انسانی ارادہ کے بغیر ہوتا ہے، خواہ انسان اسے چاہیے یا نہ چاہے۔

فرائڈ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ نیات اور اعمال کا اس احتیاط اور حفاظت کے ساتھ تحت شعور میں ضبط رہنا کارخانہ قدرت کے اندر کون سے مقصد کو پورا کرتا ہے،

اس لئے وہ فلسفیوں کو اس مسئلے پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے، مگر اس واقعہ کو آخرت کے نظریے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو فوراً اس کی معنویت سمجھ میں آ جاتی ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس امکان کو ظاہر کرتا ہے کہ جب دوسری زندگی شروع ہو گی تو ہر شخص اپنے پورے نامہ اعمال کے ساتھ وہاں موجود ہو گا، آدمی کا خود اپنا وجود گواہی دے رہا ہو گا کہ کن نیتوں اور کن خیالات کے ساتھ اس نے دنیا میں زندگی بسر کی تھی

ولقد خلقنا الانسان و نعلمُ ما توسوس به نفسہو نحنُ اقربُ الیہ من حبل (الورید۔ ق۔ ۱۶)

ترجمہ:۔ اور ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں، اور ہم اس کے رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اب قول کے مسئلے کو لیجئے نظریہ آخرت یہ کہتا ہے کہ آدمی اپنے اقوال کے لئے جواب دہ ہے، آ خواہ بھلی بات کہیں یا کسی کو گالی دیں، آدمی اپنی زبان کو سچائی کا پیغام پہنچانے کے لئے استعمال کرے یا وہ شیطان کا مبلغ بن جائے، ہر حال میں ایک کائناتی انتظام کے تحت اس کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے(مایلفظُ من قول الا لدیہ رقیب عتید،)اور یہ ریکارڈ آخرت کی عدالت میں حساب کے لئے پیش ہو گا،

یہ بھی ایک چیز جس کا ممکن الوقوع ہونا ہماری دنیا کے عین مطابق ہے، ہم جانتے ہیں کہ جبکوئی شخص بولنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت دیتا ہے تو اس حرکت سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں جس طرح ساکن پانی میں پتھر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں، اگر آپ ایک برقی گھنٹی کو شیشہ کے اندر مکمل طور پر بند کر دیں اور بجلی کے ذریعہ سے اسے بجائیں تو آنکھوں کو وہ گھنٹی بجتی ہوئی نظر آئے گی، مگر آواز سنائی نہیں دے گی، کیونکہ شیشہ بند ہونے کی وجہ سے اس کی لہریں ہمارے کانوں تک

نہیں پہنچ رہی تھی، یہی لہریں ہیں، جو ''آواز'' کی صورت میں ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں، اور کان کے آلات انھیں اخذ کر کے ان کو ہمارے دماغ تک پہنچا دیتے ہیں اور اس طرح ہم بولے ہوئے الفاظ کو سمجھنے لگتے ہیں جس کو ''سننا'' کہا جاتا ہے۔

ان لہروں کے سلسلے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد مستقل طور پر فضا میں باقی رہتی ہیں، اور یہ ممکن ہے کہ کسی بھی وقت انھیں دہرایا جا سکے، اگر چہ سائنس ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ ان آوازوں یا صحیح تر الفاظ میں ان لہروں کو گرفت کر سکے جو قدیم ترین زمانے سے فضا میں حرکت کر رہی ہیں، اور نہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی خاص کوشش ہوئی ہے، تاہم نظری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایسا آلہ بنایا جا سکتا ہے، جس سے زمانہ قدیم کی آوازیں فضا سے لے کر اسی طرح سنی جا سکیں جس طرح ہم ریڈیو سٹ کے ذریعہ ان لہروں کو فضا سے وصول کر کے سنتے ہیں، جو کسی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے بھیجی گئی ہوں.

فی الحال اس سلسلے میں جو مشکل ہے، وہ ان کو گرفت کرنے کی نہیں ہے بلکہ الگ کرنے کی ہے، ایسا آلہ بنانا آج بھی ممکن ہے، جو قدیم آوازوں کو گرفت کر سکے، مگر ابھی ہم کو ایسی کوئی تدبیر نہیں معلوم جس کے ذریعہ سے بے شمار ملی ہوئی آوازوں کو الگ کر کے سنا جا سکے، مگر ابھی ہم کو ایسی کوئی تدبیر نہیں معلوم جس کے ذریعہ سے شمار ملی ہوئی آوازوں کو الگ کر کے سنا جا سکے، یہی وقت ریڈیو نشریات میں بھی ہے، مگر اس کو ایک مصنوعی طریقہ اختیار کر کے حل کر لیا گیا ہے، دنیا بھر میں سینکڑوں ریڈیو اسٹیشن ہیں، جو ہر وقت مختلف قسم کے پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں، یہ تمام پروگرام ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ہر وقت ہمارے گرد و پیش گزرتے رہتے ہیں، بظاہر یہ ہونا چاہیے کہ ہم ریڈیو کھولیں تو بیک وقت بہت سی نا قابل فہم آوازیں ہمارے کمرے میں گونجنے لگیں، مگر ایسا نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ

ہے کہ تمام نشر گاہیں، اپنی اپنی ''آواز'' کو مختلف طول موج پر نشر کرتی ہیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی، اس طرح مختلف نشر گاہوں سے نکلی ہوئی آوازیں مختلف طول کی موجوں میں فضا کے اندر پھیلتی ہیں، اب جہاں کی آواز جس میٹر بینڈ پر نشر کی جاتی ہے، اس پر اپنے ریڈیو سٹ کی سوئی گھما کر ہم وہاں کی آواز سن لیتے ہیں۔

اسی طرح غیر مصنوعی آوازوں کو الگ کرنے کا کوئی طریقہ ابھی دریافت نہیں ہوا، ورنہ آج بھی ہم ہر زمانے کی تاریخ کو اس کی اپنی آواز میں سن سکتے تھے، تاہم اس سے یہ امکان قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے، اس تجربہ کی روشنی میں نظریہ آخرت کا یہ جزو ہمارے لئے بعید از قیاس نہیں رہتا کہ انسان جو کچھ بولتا ہے، وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے مطابق ایک روز ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہو گی، ایران کے سابق وزیر ڈاکٹر مصدق ۱۹۵۳ء میں جب مقدمے کے دوران میں نظر بند تھے تو ان کے کمرے میں خفیہ طور پر ایسی ریکارڈنگ مشین لگا دی گئی تھیں، جو ہر وقت متحرک رہتی تھیں، اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو ریکارڈ کر لیتی تھیں تا کہ عدالت میں ان کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے ہمارا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی طرح ہر شخص کے ساتھ خدا نے فرشتے یا دوسرے لفظوں میں بہت سے غیر مرئی ''حافظین'' (recorder.) لگے ہوئے ہیں، جو ہمارے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو نہایت درجہ صحت کیساتھ کائنات کی پلیٹ پر نقش کر رہے ہیں۔

اب عمل کے مسئلے کو لیجئے، اس سلسلے میں بھی ہماری معلومات حیرت انگیز طور پر اس کا ممکن الوقوع ہونا ثابت کرتی ہیں، سائنس بتاتی ہے کہ ہمارے تمام اعمال، خواہ وہ اندھیرے میں کئے گئے ہوں یا اجالے میں تنہائی میں انکا ارتکاب ہوا ہو یا مجمع کے اندر سب کے سب فضا میں تصویری حالت میں موجود ہیں، اور کسی بھی وقت ان کو یکجا کر کے ہر شخص کا پورا کارنامہ حیات معلوم کیا جا سکتا ہے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ اندھیرے میں ہو یا اجالے میں ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت کر رہی ہو، وہ جہاں یا جس حالت میں ہو، اپنے اندر سے مسلسل حرارت خارج کرتی رہتی ہے، یہ حرارت چیزوں کے ابعاد و اشکال کے اعتبار سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ بعینہ اس چیز کا عکس ہوتی ہے جس سے وہ نکلتی ہے جس طرح آواز کی لہریں اس مخصوص تھرتھراہٹ کا عکس ہوتی ہیں، جو کسی زناب پر حاوی ہوئی تھیں، چنانچہ ایسے کیمرے ایجاد کئے گئے ہیں، جو کسی چیز سے نکلی ہوئی حرارتی لہروں (heat waves.) کو اخذ کر کے اس کی اس مخصوص حالت کا فوٹو تیار کر دیتے ہیں جب کہ وہ لہریں اس سے خارج ہوئی تھیں، مثلاً میں اس وقت ایک مسجد میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں اور اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مگر یہاں اپنی موجودگی کے دوران میں میں نے جو حرارتی لہریں خارج کی ہیں، وہ بدستور موجود رہیں گیا اور حرارت دیکھنے والی مشین کی مدد سے خالی شدہ مقام سے میرا مکمل فوٹو حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ اس وقت جو کیمرے بنے ہیں وہ چند گھنٹوں بعد ہی تک کسی لہر کا فوٹو لے سکتے ہیں، اس کے بعد اس کی لہروں کا عکس اتارنے کی طاقت ان میں نہیں ہے۔

ان کیمروں میں انفراڈ شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے وہ اندھیر اور اجالے میں یکساں فوٹو لے سکتی ہیں، امریکہ اور انگلینڈ میں اس دریافت سے کام لینا شروع ہو گیا ہے، چند سال پہلے کی بات ہے، ایک رات نیویارک کے اوپر ایک پر اسرار ہوائی جہاز چکر لگا کر چلا گیا، اس کیذ را بعد مذکورہ بالا کیمرے کے ذریعہ فضا سے اس کی حرارتی تصویر لی گئی، اس کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا کہ اڑنے والا جہاز کس ساخت کا تھا، (ریڈر ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۰ء) اس کیمرے کو مصور حرارت (evaporagraph.) کہتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم تاریخ کو پردۂ فلم کے اوپر دیکھ سکیں گے

اور ہوسکتا ہے کہ پچھلے ادوار کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہوں جو ہمارے موجودہ تاریخی نظریات کو بالکل بدل ڈالیں۔

یہ ایک حیرت انگیز دریافت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فلم اسٹوڈیو میں نہایے تیز رفتار کیمرے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تمام حرکات وسکنات کی تصویر لیتے رہتے ہیں، اسی طرح عالمی پیمانے پر ہر شخص کی زندگی فلمائی جارہی ہے، آپ خواہ کسی کو تھپڑ ماریں یا کسی غریب کا بوجھ اُٹھادیں، اچھے کام میں مصروف ہوں یا برے کام کے لئے دوڑ دھوپ کررہے ہوں، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں، جہاں اور جس حال میں ہوں، ہر وقت آپ کا تمام عمل کائنات کے پردہ پر نقش ہورہا ہے، آپ اسے روک نہیں سکتے، اور جس طرح فلم اسٹوڈیو میں دہرائی ہوئی کہانی کو اس کے بہت بعد اور اس سے بہت دور رہ کر ایک شخص اسکرین پر اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ عین مقوع واردات پر موجود ہو، ٹھیک اسی طرح ہر شخص نے جو کچھ کیا ہے اور جن واقعات کے درمیان اس نے زندگی گزاری ہے، اس کی پوری تصویر ایکروز اس کے سامنے اس طرح آسکتی ہے کہ اس کو دیکھ کر وہ پکار اٹھے:

مالهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها۔

(کہف۔ ۴۹)

ترجمہ:۔ یہ کیسا دفتر ہے جس نے میرا چھوٹا بڑا کوئی کام بھی درج کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر انسان کا مکمل اعمال نامہ تیار کیا جا رہا ہے، جو خیال بھی آدمی کے دل میں گزرتا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے، اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ ہورہا ہے، ہر آدمی کے اردگرد ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں، جو اندھیرے اور اجالے کی تمیز کئے بغیر شب و روز اس کا فلم تیار کررہے ہیں، گویا انسان کا قلبی عمل ہو یا لسانی عمل یا

عضوی عمل ہر ایک نہایت با قاعدگی کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے، اس حیرت انگیز صورحال کی توجیہہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ خدا کی عدالت میں ہر انسان کا جو مقدمہ پیش ہونے والا ہے، یہ سب اس کی شہادت فراہم کرنے کے انتظامات ہیں، جو خود عدالت کی طرف کئے گئے ہیں، کوئی بھی شخص ان واقعات کی اس سے زیادہ معقول توجیہہ پیش نہیں کرسکتا، اب اگر یہ صریح واقعہ بھی آدمی کو آخرت میں ہونے والی بازپرس کا یقین نہیں دلاتا، تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا واقعہ ہوگا جو اس کی آنکھ کھولے گا۔

تقاضا:۔

اوپر ہم نے آخرت کے تصور پر اس حیثیت سے بحث کی ہے کہ موجودہ کائنات میں کیا اس قسم کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن ہے جس کا مذہب میں دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ آخرت قطعی طور پر ممکن الوقوع ہے، اب یہ دیکھئے کہ کیا ہماری دنیا کو اس قسم کی آخرت کی کوئی ضرورت بھی ہے، کیا کائنات اپنے موجودہ ڈھانچہ کے اعتبار سے تقاضا کرتی ہے کہ آخرت لازماً وقوع میں آئے؟

سب سے پہلے نفسیاتی پہلو کو لیجئے۔۔۔ کنگھم نے اپنی کتاب (plao,s apology) میں زندگی بعد موت کے عقیدے کو خوش کن لاادریت (cheerful agosticism.) کہا ہے، یہی موجودہ زمانے میں تمام بے خدا مفکرین کا نظریہ ہے، ان کا خیال ہے کہ دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کی اس ذہنیت نے پیدا کیا ہیکہ وہ اپنے لئے ایک ایسی دنیا تلاش کرنا چاہتا ہے جہاں وہ موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور مشکلات سے آزاد ہو کر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے، یہ عقیدہ انسان کی محض ایک مفروضہ خوش فہمی ہے، جس کے ذریعہ وہ اس خیالی تسکین میں مبتلا رہنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی محبوب زندگی پالے گا، ورنہ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے، ایسی کوئی دنیا واقعہ میں موجود نہیں ہے مگر انسان کی یہ طلب

بذات خود آخرت کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے، اسی طرح ایک بہتر دنیا کی طلب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی ایک دنیا فی الواقع موجود ہے اور ہم سے اسکا براہ راست تعلق ہے تاریخ بتاتی ہیکہ قدیم ترین زمانے سے عالم گیر پیمانے پر یہ طلب انسان کے اندر موجود رہی ہے، اب یہ نا قابل قیاس ہے کہ ایک بے حقیقت چیز اتنے بڑے پیمانے پر اور اس قدر ابدی شکل میں انسان کو متاثر کردے، ایک ایسا واقعہ جو ہمارے لئے اس امکان کا قرینہ پیدا کرتا ہے کہ دوسری بہتر دنیا موجود ہونی چاہیے، خود اسی واقعہ کو فرضی قرار دینا صحیح ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اتنے بڑے نفسیاتی تقاضے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پھر اس زمین پر کون سا واقعہ ہے جس کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اور اگر سمجھتے ہیں تو اس کے لئے ان کے پاس کیا دلیل ہے، یہ خیالات اگر صرف ماحول کا نتیجہ ہیں تو وہ انسانی جذبات کے ساتھ اتنی مطابقت کیوں رکھتے ہیں کیا دوسری کسی ایسی چیز کی مثال دی جاسکتی ہے، جو ہزاروں سال کے دوران میں اس قدر تسلسل کے ساتھ انسانی جذبات کے ساتھ اپنی مطابقت باقی رکھ سکی ہو، کیا کوئی بڑے سے بڑا قابل شخص یہ صلاحت رکھتا ہے کہ ایک فرضی چیز گڑھے اور اس کو نفسیات میں اس طرح شامل کر دے، جس طرح یہ احساسات انسانی نفسیات میں سموئے ہوئے ہیں۔

انسان کی بہت سی تمنائیں ہیں، جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتیں، انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں صرف زندگی ہو، مگر اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے، جہاں زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے علم، تجربہ اور جدوجہد کے نتیجہ میں جب اپنی کامیاب ترین زندگی کے آغاز کیقابل ہوتا ہے، اسی وقت اس کے لئے موت کا پیغام آجاتا ہے، لندن کے کامیاب تاجروں کے متعلق اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ۴۵-۶۵ سال کی عمر کے درمیان جب وہ اپنا کروبار

خوب جما لیتے ہیں، اور پانچ ہزار تا دس ہزار پونڈ (ایک لاکھ روپے سے زیادہ) سالانہ کما رہے ہوتےہیں، اسوقت اچانک ایک روز ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، ونود ریڈی(winwood reade.) لکھتا ہے:۔

''یہ ہمارے لئے ایک غیر غور طلب مسئلہ ہے کہ کیا خدا سے ہمارا کوئی ذاتی رشتہ ہے، کیا اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے ہے، جہاں ہمارے عمل کے مطابق ہم کو بدلہ دیا جائے گا، یہ نہ صرف فلسفہ کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے بلکہ خود ہمارے لئے سب سے بڑا عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہمارا مفاد بہت زیادہ وابستہ ہے، موجودہ زندگی بہت مختصر ہے، اور اس کی خوشیاں بہت معمولی ہیں، جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں، جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آ چکا ہوتا ہے، اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص اس طرح زندگی گزارنے سے انکار نہیں کرے گا۔''

martyrdom of man,p.414.

مگر یہی مصنف فطرت کی اتنی بڑی پکار کو محض ایک معمولی سے اشکال کی بنا پر رد کر دیتا ہے:

''یہ نظریہ اس وقت تک بظاہر بڑا معقول نظر آتا تھا، جب تک گہرائی کے ساتھ ہم نے اس کی تحقیق نہیں کی تھی، مگر جب ایسا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ محض ایک لغو (absurd.) بات ہے، اور اس کی لغویت کو با آسانی ثابت کیا جا سکتا ہے۔۔۔محروم العقل آدمی جو کہ اپنے گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہے، وہ تو جنت میں جائے گا، مگر گوئٹے اور روسو جیسے لوگ دوزخ میں جلیں گے! اس لئے محروم العقل پیدا ہونا اس سے اچھا

ہے کہ آدمی گوئٹے اور روسو کی شکل میں پیدا ہو، اور یہ بات بالکل لغو ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۴۱۵)

یہ ویسی ہی بات ہے جیسے لارڈ کلون (kelvin .) نے میکس ویل (maxwell.) کی تحقیق کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، لارڈ کلون کا کہنا تھا کہ" جب تک میں کسی چیز کا مشینی ماڈل (mechanical model.) نہیں بنا لیتا میں اسے سمجھ نہیں سکتا۔" اس بنا پر اس نے روشنی کے متعلق میکسیول کے برقی مقناطیسی نظریے کو قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ اس کے مادی فریم میں نہیں آتی تھی، طبیعیات کی دنیا میں آج یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ جے ڈبلیو، این، سولیون (sullivan.) کے الفاظ میں ۔۔۔" ایک شخص کیوں ایسا خیال کرے کہ فطرت کو ایک ایسی نوعیت کی چیز ہونا چاہیے، جس کو انیسویں صدی کا ایک انجینئر اپنے کارخانہ میں ڈھال سکتا ہو" یہی بات میں ون وڈ کے مندرجہ بالا اعتراض میں کہوں گا، ۔۔" بیسویں صدی کا ایک فلسفی آخر یہ سمجھنے کا کیا حق رکھتا ہے کہ خارجی دنیا کو اس کے اپنے مزعومات کے مطابق ہونا چاہیے۔"

مصنف کی سمجھ میں اتنی موٹی بات نہیں آئی کہ حقیقت واقعہ خارج کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود خارج حقیقت واقعہ کا محتاج ہوتا ہے، جب حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور اس کے سامنے حساب کتاب کے لئے ہمیں حاضر ہونا ہے تو پھر ہر شخص کو خواہ وہ روسو ہو یا ایک معمولی شہری، خدا کا وفادار بن کر زندگی گزارنی چاہیے، ہماری کامیابی حقیقت سے موافقت کرنے میں ہے نہ کہ اس کے خلاف چلنے میں،، مصنف روسو گوئٹے سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنائیں بلکہ خود حقیقت واقعہ سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے آ کو بدل ڈالے اور جب وہ اپنے اندر تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتی تو حقیقت واقع کو لغو قرار دیتا ہے، حالانکہ یہ

ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص جنگی راز کے تحفظ کے قانون کو اس بنا پر لغو قرار دے کہ اس کی رو سے بعض اوقات ایک معمولی سپاہی کا کام قابل تعریف قرار پاتا ہے، اور روزن برگ جیسے ممتاز سائنس دان اور اس کی نوجوان اور حسین بیوی (rosenberg pair.) کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر پھانسی دے دی جاتی ہے۔

ساری معلوم دنیا کے اندر صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (tomorrow.) کا تصور رکھتا ہے، یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بہت سے جانور بھی ''کل'' کے لئے عمل کرتے ہیں، مثلاً چیونٹیاں گرمی کے موسم میں جاڑے کیلئے خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے لئے گھونسلا بناتا ہے، مگر جانوروں کا اس قسم کا عمل محض جبلت کے تحت غیر شعوری طور پر ہوتا ہے، وہ ''کل'' کی ضرورتوں کو سوچ کر بالقصد ایسا نہیں کرتے، بلکہ بلا ارادہ طبعی طور پر انجام دیتے ہیں،، اور بطور نتیجہ وہ ان کے مستقبل میں انھیں کام آتا ہے ''کل'' کو ذہن میں رکھ کر اس کی خاطر سوچنے کے لئے تصوری فکر (conceptual thought.) کی ضرورت ہے، اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کسی دوسرے جاندار کو تصوری فکر کی خصوصیت حاصل نہیں۔

انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مواقع ملنے چاہیں، جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی ''کل'' نہیں رکھتے مگر انسان کا مطالعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس کے لئے ایک ''کل'' ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا نظام فطرت کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ زندگی میں ہماری ناکامیاں، عام طور پر، ہم کو اس سے بہتر ایک زندگی کی توقع کی طرف لے جاتی ہیں، ایک خوش حال فضا میں ایسا عقیدہ باقی نہیں رہ سکتا، روم کے غلام، مثال کے طور پر بہت بڑی تعداد میں عیسائی

ہو گئے، کیونکہ عیسائیت انھیں آسمان میں خوشی حاصل ہونے کی توقع دلاتی تھی، یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے انسان کی خوشی اور خوش حالی بڑھے گی، اور بالآخر دوسری زندگی کا تصور ختم ہو جائے گا۔

مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی چار سو سالہ تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتی ٹکنالوجی کی ترقی نے سب سے پہلے دنیا کو جو چیز دی وہ یہ تھا کہ سرمایہ رکھنے والے محدود گروہ کو ایسے وسائل و ذرائع ہاتھ آ گئے جس کے بل پر وہ چھوٹے کاریگروں اور پیشہ وروں کو ختم کر کے دولت کا تمام بہاؤ اپنی طرف کر لیں اور عام باشندوں کو محض اپنا محتاج مزدور بنا کر رکھ دیں، اس انجام کے ہول ناک مناظر مارکس کی کتاب ''کیپٹل'' میں تفصیل کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں، جو گویا اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اس مزدور طبقہ کی چیخ ہے، جس کو مشینی نظام نے اپنے ابتدائی دور میں جنم دیا تھا، اس کے بعد ردعمل شروع ہوا اور مزدور تحریکوں کی ایک صدی کی کوشش سے اب حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں مگر یہ تبدیلی صرف ظاہر کی تبدیلی ہے، بے شک آج کا مزدور پہلے کے مزدور کے مقابلے میں زیادہ اجرت پاتا ہے، لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کی دولت کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ محروم ہے۔۔۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے جو نظام بنایا ہے وہ کچھ مادی ظواہر انسان کو دے، دے، مگر خوشی اور اطمینان قلب کی دولت پھر بھی اسے نہیں دیتا، تہذیب جدید کے انسان کے بارے میں بلیک (black.) کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں:۔

A mark in every face i meet ,marks of weakness marks of woe.

برٹرنیڈ رسل نے اعتراف کیا ہے کہ ''ہماری دنیا کے جانور خوش ہیں، انسانوں کو بھی خوش ہونا چاہیے، مگر جدید دنیا میں انھیں یہ نعمت حاصل نہیں۔''

(conquest of happiness,p11.)

بلکہ رسل کے الفاظ میں اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اس

کا حصول ممکن ہی نہیں:۔

happiness in the modern world has become an impossibility,p.93

نیو یارک جانے والا ایک سیاہ ایک طرف تو اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارتوں کو دیکھتا ہے جس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں، اور جو اتنی اونچی ہے کہ اس کا اوپر کا ٹمپریچر نیچے کے مقابلے میں کافی سرد ہو جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اتریں تو یہ مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آپ اس پر گئے تھے، ۱۲۵۰ فٹ بلند عمارت پر چڑھنے میں لفٹ کیذ ریعہ صرف تین منٹ لگتے ہیں، ان عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر وہ کلب میں جاتا ہے، وہاں وہ دیکھتا ہے کہ عورت مرد سب مل مل کر خوب ناچ رہے ہیں۔ ''کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ،'' وہ سوچتا ہے، مگر زیادہ دیر گزرنے نہیں پاتی کہ اس جھنڈ میں سے ایک نوجوان عورت آ کر اس کے پاس نشست پر بیٹھ جاتی ہے، وہ بہت افسردہ ہے۔

''سیاح! کیا میں بہت بدصورت ہوں'' عورت کہتی ہے۔

''میرا خیال تو ایسا نہیں ہے۔''

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں رعنائی (glamour.) نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں تو تم میں گلے مر ہے۔''

''شکریہ، لیکن اب نہ مجھے نوجوان ٹیپ (tap.) کرتے ہیں اور نہ ڈیٹ (date.) مانگتے ہیں، مجھے زندگی ویران نظر آنے لگی ہے۔''

یہ جدید دور کے انسان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے، حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے صرف مکانوں کو ترقی دی ہے، اس نے مکینوں کے دل کا سکون چھین لیا ہے، اس نے شاندار مشینیں کھڑی کی ہیں، مگر ان مشینوں میں کام کرنے والے انسانوں کو چین سے محروم کر دیا ہے، یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ۴ سو سالہ تاریخ کا آخری انجام ہے، پھر کس بنیاد پر یقین کر لیا جائے کہ سائنس اور ٹکنالوجی وہ سکون اور

مسرت کی دنیا بنانے میں کامیاب ہوگی جس کی انسان کو تلاش ہے۔

۲۔ اب اخلاقی تقاضے کو لیجئے، اس حیثیت سے جب ہم دیکھتے ہیں تو دنیا کے حالات شدید طور پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی ایک آخرت ہو، اس کے بغیر ساری تاریخ بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہمارا ایک فطری احساس ہے کہ ہم غیر اور شر، ظلم اور انصاف میں تمیز کرتے ہیں، انسان کے سوا کسی بھی مخلوق کے اندر یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی، مگر انسان ہی کی دنیا وہ دنیا ہے، جہاں اس احساس کو سب سے زیادہ پامال کیا جا رہا ہے، انسان اپنے ابنائے نوع پر ظلم کرتا ہے، وہ اس کو لوٹتا ہے، اس کو قتل کرتا ہے، اور طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتا ہے، حالانکہ جانوروں تک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی نوع کے ساتھ سفاکی نہیں کرتے، بھڑیے اور شیر اپنی نوع کے لئے بھیڑیے اور شیر نہیں ہیں، مگر انسان خود انسان کے لئے بھڑیا بنا ہوا ہے، بے شک انسانی تاریخ میں حق شناسی کی چنگاریاں بھی ملتی ہیں، اور وہ سب بہت قابل قدر ہیں، مگر اس کا بڑا حصہ حق تلفی کی روداد سے بھرا ہوا ہے، مورخ کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ انسان کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے، دنیا کے واقعی حالات اس کے خلاف ہیں، یہاں میں چند اقوال نقل کروں گا۔

والٹیر:۔ ''انسانی تاریخ محض جرائم اور مصائب کی ایک تصویر ہے۔''

ہربرٹ اسپنسر:۔ ''تاریخ محض بے فائدہ گپ ہے۔''

اڈورڈ گبن:۔ ''تاریخ تمام کی تمام لایعنی قصے کا نام ہے۔''

ہیکل:۔ ''پبلک اور حکومت نے تاریخ کے مطالعہ سے جو واحد چیز سیکھی ہے وہ صرف یہ کہ انھوں نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔''

Western civilisation by edward menall burns,p871.

کیا انسانیت کا یہ عظیم الشان ڈراما اسی لئے کھیلا گیا تھا کہ وہ اس طرح کی ایک ہولناک کہانی وجود میں لاکر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے ہماری فطرت جواب دیتی

ہے کہ نہیں، انسان کے اندر عدل وانصاف کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ایسا ہونا چاہیے، ایک دن ایسا آنا ضروری ہے، جب حق اور ناحق الگ ہو، ظالم کو اس کے ظلم کا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ ملے، یہ ایک ایسی طلب ہے، جس کو اسی طرح تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا جس طرح اسے انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

فطرت اور واقعہ کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس خلا کو لازماً پر ہونا چاہیے۔۔۔ جو کچھ ہو رہا ہے، اور جو کچھ ہونا چاہیے، دونوں کا فرق ثابت کرتا ہے کہ ابھی زندگی کے ظہور کا کوئی اور اسٹیج باقی ہے، یہ خلا پکار رہا ہے کہ ایک وقت ایسا ہونا چاہیے جب دنیا کی تکمیل ہو، مجھے حیرت ہے کہ لوگ ہارڈی کے فلسفہ پر ایمان لا کر دنیا کو ظلم اور بے رحمی کی جگہ سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہی ظالمانہ صورت حال انھیں اس یقین کی طرف نہیں لے جاتی کہ جو کچھ آج موجود نہیں ہے، مگر عقل جس کا تقاضا کرتی ہے، اسے کل وقوع میں آنا چاہیے۔

''قیامت نہ ہو تو ان شیاطین کا سر کون توڑے''۔۔۔ یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ اس وقت میری زبان سے نکل جاتا ہے، جب میں اخبار پڑھتا ہوں، اخبار گویا دنیا کے روزانہ حالات کی ایک تصویر ہے، مگر اخبار ہمیں دنیا کے حالات کے بارے میں کیا بتاتے ہیں، وہ اغوا اور قتل کی خبریں دیتے ہیں، چوری اور الزام تراشی کی داستانیں سناتے ہیں، سیاسی تجارت اور تاجرانہ سیاست کے جھوٹے پروپیگنڈے ہمارے دماغوں میں بھرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ فلاں حکمران نے اپنے ماتحت کمزوروں کو دبا لیا، فلاں قوم نے قومی مفاد کے لئے فلاں علاقے پر قبضہ کر لیا، غرض اخبار، درویش اور اور سلطان کی عیاریوں کی داستان کے سوا اور کچھ نہیں، اور مستقبل قریب میں ہندوستان میں ہونے والے حادثات خاص طور پر جبل پور، کلکتہ، جمشید پور اور اوڑیسا کی تقتل و غارت گری کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

اس دنیا میں کسی بھی قابل قیاس یا نا قابل قیاس بدترین برائی کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہیے، ایک قوم سیکولرزم، جمہوریت اور اہنسا کی علمبردار بن کر وحشیانہ فرقہ واریت، سفاکانہ آمریت اور بدترین تشدد کا ارتکاب کر سکتی ہے، ایک لیڈر جس کو محسن انسانیت اور پیغمبر امن و امان کا خطاب دیا گیا ہو عین اس کے اقتدار میں انسانیت کے اوپر ایسے شرمناک مظالم کئے جا سکتے ہیں، جن سے چیتے اور بھیڑے اور جنگلی سور بھی پناہ مانگیں، حتیٰ کہ نشر و اشاعت کے اس دور میں یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے ملک میں بہت بڑے پیمانے پر کھلم کھلا ایک گروہ کو لوٹنے، جلانے اور قتل کرنے کے انتہائی بھیانک واقعات نہایت منظم طریقے پر ہوں اور مہینوں اور سالوں ہوتے رہیں، مگر اس کے باوجود دنیا کا پریس ان سے بے خبر ہو اور تاریخ کے صفحات سے وہ اس طرح محو ہو جائیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔ کیا یہ دنیا اسی لئے بنائی گئی تھی کہ مکاری، شیطنت، درندگی اور ڈاکہ زنی کے ان ہولناک ڈراموں کا بس ایک اسٹیج بن کر رہ جائے اور اس کے بعد نہ ظالم کے لئے کچھ ہو اور نہ مظلومن کے لئے کچھ۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نامکمل ہے، اور اس کا نامکمل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک وقت آنا چاہیے، جب وہ مکمل کی جائے۔

اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھئے، قدیم رین زم، انے سے انسان کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ لوگوں کو حق و صداقت کی راہ پر کیسے قائم رکھا جائے، اگر اس مقصد کے لئے افراد کے مقابلے میں کچھ لوگوں کو سیاسی اختیار دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے ماتحت ان کی گرفت کے خوف سے زیادتیاں نہ کریں۔۔۔ مگر اس تدبیر میں خود ان صاحب اختیار افراد کو عدل پر قائم رکھنے کا کوئی محرک موجود نہیں ہے، اگر اس مقصد کے لئے قانون بنایا جائے اور پولیس کا محکمہ قائم ہو تو ان مقامات اور مواقع پر آدمی کو کون کنٹرول کرے جہاں پولیس اور قانون نہیں پہونچتے اور نہیں پہنچ سکتے

اگر اپیل اور پروپیگنڈے کی مہم چلائی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض کسی کی اپیل کی بنا پر کوئی شخص اپنے ملتے ہوئے فائدے کو کیوں چھوڑے گا، دنیا کی سزا کا خوف بدعنوانیوں کو ہرگز روک نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ جھوٹ، رشوت، سفارش، اثرات کا ناجائز استعمال اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے ذرائع موجود ہیں جو سزا کے ہر امکان کو یقینی طور پر ختم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا محرک ہی بدعنوانیوں کو روکنے میں کارگر ہو سکتا ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہو انسان کے اپنے ارادے میں شامل ہو جائے خارجی محرک کبھی اس معاملے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اور یہ بات صرف آخرت کے تصور میں ممکن ہے، آخرت کے نظریے میں ایک ایسا محرک موجود ہے جو بدعنوانیوں کے بچنے کے مسئلے کو ہر شخص کا اپنا مسئلہ بنا دیتا ہے، وہ ہر شخص کے لئے یکساں اہمیت رکھتا ہے، خواہ وہ ماتحت ہو یا افسر، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے خدا کے یہاں جانا ہے، اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اس سے لازماً باز پرس کرے گا، مذہبی عقیدے کی اسی اہمیت کی بنا پر سترھویں صدی کے آخر کے ایک نامور جج میتھو ہیل (mathew halos.) نے کہا ہے:۔

''یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے، ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جس سے سماجی نظام کو برقرار رکھا جاتا ہے۔''

religion without revelation,p115.

نظریہ آخرت کا یہ پہلو کتنا اہم ہے، اس، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بہت سے لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، جو اس بات کو بطور حقیقت ایک واقعہ نہیں مانتے کہ کوئی فیصلہ کا دن آنے والا ہے، وہ بھی تاریخ کے تجربے کی بنا پر ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، جو انسان کو قابو میں رکھ سکتی ہو اور ہر حال میں اس کو عدل و انصاف کی روش پر قائم رہنے کیلئے مجبور کر سکے، مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے خدا کے تصور کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اس کی موجودگی کا کوئی تسلی بخش

ثبوت ہم کو نہیں ملتا اس کے نزدیک نظری معقولیت (theoretical reason.)تو یقیناً مذہب کے حق میں نہیں، مگر اخلاقی پہلو سے مذہب کی عملی معقولیت(practical teason.) کو وہ تسلیم کرتا ہے، والیٹر(voltaire.) کسی مابعد الطبیعی حقیقت کو نہیں مانتا، مگر اس کے نزدیک:۔

''خدا اور دوسری زندگی کے تصور کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے لئے مفروضے(postulates of the moral feeling.) کا کام دیتے ہیں، اس کے نزدیک صرف اسی کے ذریعے سے بہتر اخلاق کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسن عمل کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہتا، اور اس طرح سماجی نظم کا برقرار رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔''

(history of philosophy by windelband,p.496.)

جو لوگ آخرت کو ایک فرضی تصور کہتے ہیں، ان کو سوچنا چاہیے کہ آخرت اگر فرضی ہے تو ہمارے لئے اس قدر ضروری کیوں ہے، کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح معنوں میں کوئی سماجی نظام بنا ہی نہیں سکتے، انسانی ذہن سے اس تصور کو نکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہو جاتی ہے، کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لئے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے، کیا اس کائنات میں ایسی مثال پائی جاتی ہے، کہ ایک چیز حقیقت میں موجود نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اس قدر حقیقی بن جائے، زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، مگر اس کے باوجود وہ زندگی سے اتنی متعلق نظر آئے۔ زندگی کی صحیح اور منصفانہ تنظیم کے لئے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخرت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ تصور آخرت کے حق میں استدلال کا یہ ایک ایسا پہلو ہے، جو اس نظریے کو لیبارٹری ٹسٹ کے معیار پر صحیح ثابت کر رہا ہے۔

۳۔ اب ایک اور پہلو سے دیکھئے جس کو میں ''کائناتی تقاضا'' کہتا ہوں، پچھلے باب میں میں نے کائنات میں خدا کے وجود پر بحث کی ہے، اس سے یہ بات واضح

ہو چکی ہے کہ عین علمی اور عقلی مطالعہ ہی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کائنات کا ایک خدا مانیں، اب اگر اس دنیا کا کوئی خدا ہے تو یقیناً بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کو ظاہر ہونا چاہیے، یہ کب ظاہر ہوگا جہاں تک موجودہ دنیا کا معاملہ ہے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ آج یہ تعلق ظاہر نہیں ہو رہا ہے، آج جو شخص خدا کا منکر ہے اور کھلے عام یہ اعلان کرتا ہے کہ ''میں خدا سے نہیں ڈرتا'' اس کو لیڈری اور حکومت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے برعکس جو خدا کے بندے خدا کا کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی سرگرمیوں کو وقت کا اقتدار غیر قانونی قرار دے دیتا ہے، جو لوگ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا اور راستے میں اس کو کہیں خدا نہیں ملا،]ان کے نظریات کو پھیلانے کے لئے بے شمار ادارے کام کر رہے ہیں، اور پورے پورے ملکوں کے ذرائع و وسائل ان کی خدمت کے لئے وقف ہیں اور جو لوگ خدا اور مذہب کی بات پیش کر رہے ہیں، ان کو تمام ماہرین اور علمائے وقت رجعت پسند اور ماضی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا کہہ کر رد کر دیتے ہیں، لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، انقلابات آتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، سورج نکلتا ہے، اور ڈوب جاتا ہے، مگر خدا کی خدائی کا کہیں ظہور نہیں ہوتا، ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں یا نہیں، اگر ہم خدا کو مانتے ہیں تو ہمیں آخرت کو بھی ماننا پڑے گا، کیونکہ خدا اور بندوں کا تعلق ظاہر ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔

ڈارون اس دنیا کا ایک خالق (creator) تسلیم کرتا ہے، مگر اس نے زندگی کی جو تشریح کی ہے، اس کے اندر خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور نہ کائنات کے کسی ایسے انجام کی ضرورے معلوم ہوتی ہے، جہاں یہ تعلق ظاہر ہو، مجھے نہیں معلوم کہ ڈارون اپنے حیاتیاتی نقطۂ نظر کے اس خلا کو کیسے پر کرے گا مگر میری عقل کو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا تو

ہومگر دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور بندوں کے مقابلے میں اس کی جو مالکانہ حیثیت ہے وہ کبھی سامنے نہ آئے، اتنی بڑی کائنات پیدا ہو کر ختم ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو کہ اس کے وجود میں آنے کا مقصد کیا تھا اور جس نے اسے بنایا تھا وہ کس قسم کی صفات رکھنے والی ہستی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر معقولیت کے ساتھ غور کیا جائے تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک آخرت آنے والی ہے، بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی، آپ دیکھیں کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لئے بے تاب ہو، اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے۔

یسئلونک عن الساعۃ ایان مرساھا قل انما علمھا عند ربی لا یجلیھا لوقتھا الا ھو ثقلت فی السموات و الارض لا تاتیکم الا بغتۃً (اعراف ۱۸۷)

ترجمہ:۔ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت کہو اس کا علم تو صرف خدا کو ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے وہ بالکل اچانک تم پر پڑے گی۔

تجرباتی شہادت:۔

اب ہم اس بحث کیآخری جزو پر آتے ہیں ''کیا کوئی تجرباتی شہادت اس بات کی موجود ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے'' اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری پہلی زندگی خود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے جو لوگ دوسری زندگی کے منکر ہیں وہ یقینی طور پر پہلی زندگی کا اقرار کر رہے ہیں، پھر جو زندگی ایک بار ممکن ہے، وہ دوسری بار کیوں ظہور میں نہیں آسکتی، ایک تجربہ جس سے آج ہم دوچار ہیں، وہی تجربہ اگر دوبارہ ہمارے ساتھ پیش آئے تو اس میں استحالہ کی کون سی بات ہے، حقیقت یہ ہے

کہ اس کائنات میں اس سے زیادہ خلاف عقل بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ایک واقعہ کو آپ حال میں تسلیم کریں مگر مستقبل کے لئے اسی واقعہ کا انکار کردیں۔

یہ موجودہ انسان کا عجیب تضاد ہے کہ کائنات کی توجیہہ کے لئے خود اس نے جو ''خدا گڑھے ہیں'' ان کے بارے میں تو وہ پورے یقین کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ پیدا کر سکتے ہیں، مگر مذہب جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے، اس کے متعلق اسے یہ تسلیم نہیں ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ وجود میں لے آئے جیمز جینز یہ بتاتے ہوئے کہ موجودہ زمین اور اس کے تمام مظاہر ایک ''حادثہ'' کے پیدا کردہ ہیں، اس نظریے کے حامیوں کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

''اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اگر ہماری زمین محض کچھ حادثات میں وجود میں آئی ہو، اگر کائنات اسی طرح لمبی مدت تک قائم رہے تو کسی بھی قابل قیاس حادثے کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔''

modern scientific thought,p.3.

نظریہ ارتقا کا دعویٰ ہے کہ حیوانات کی مختلف نوعیں ایک ہی ابتدائی نوع سے ترقی کرکے وجود میں آئی ہیں، چنانچہ ڈارون کی تشریح کے مطابق موجودہ زرافہ ابتداً دوسرے سم دار چوپایوں کی مانند تھا، مگر توالد و تناسل کے طویل عمل کے درمیان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں (variations.) کے جمع ہونے سے بالآخر وہ غیر معمولی طور پر ایک لمبا ڈھنچہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب کے ساتویں باب میں لکھتا ہے:۔

''میرے نزدیک یہ تقریباً یقینی ہے کہ (اگر کسی مدت تک مطلوبہ عمل جاری رہے تو) ایک معمولی سم دار چوپائے کو زرافہ کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔''

origin of species,p.169.

اسی طرح جس نے بھی زندگی اور کائنات کی کوئی توجیہہ کی ہے بالکل فطری طور

پر اس کو یہ بھی ماننا پڑا ہے کہ جن حالات کی موجودگی کو وہ زندگی کا سبب قرار دیتا ہے، وہی حالات اگر دوبارہ فراہم ہوسکیں تو یقیناً یہی واقعہ دوبارہ وجود میں آسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عقلی طور پر دوسری زندگی کا امکان اتنا ہی ہے جتنا پہلی زندگی کا جو خالق بھی ہم تسلیم کریں، ہم کو ماننا پڑے گا کہ وہ خالق انھیں واقعات کو دوبارہ وجود میں لاسکتا ہے جس کو اس نے ایک بار پیدا کیا ہے، اس اعتراف سے ہم صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جب کہ ہم پہلی زندگی کا انکار کردیں، پہلی زندگی کو مان لینے کے بعد ہمارے پاس دوسری زندگی کو نہ ماننے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

۲۔نفسیاتی تحقیق، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کے مطابق لاشعور یا دوسرے لفظوں میں انسان کے حافظہ کے خانے میں اس کے تمام خیالات ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتے ہیں، یہ واقعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ذہن اس کے جسم کا حصہ نہیں ہے جسم کا یہ حال ہیکہ اس کے ذرات چند سال بعد بالکل بدل جاتے ہیں، لیکن لاشعور کے دفتر میں سو سال بعد بھی کوئی تغیر، کوئی دھندلا پن، کوئی مغالطہ یا شبہ پیدا نہیں ہوتا، اگر یہ دفتر حافظہ جسم سے متعلق ہے تو وہ غائب کیوں نہیں ہوتا، یہ کون سا ریکارڈ ہے، کہ ریکارڈ کی تختی ٹوٹ کر ختم ہو جاتی ہے، مگر وہ ختم نہیں ہوتا، جدید نفسیات کا یہ مطالعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسانی وجود حقیقۃ اس جسم کا نام نہیں ہے جس پر گھساؤ اور موت کا عمل طاری ہوتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک چیز ہے جس کے لئے فنا نہیں ہے اور جو زوال میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے وجود کو مستقل طور پر یکساں حال میں باقی رکھتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فاصلہ اور وقت کے قوانین صرف ہماری موجودہ دنیا کے اندر رائج ہیں، اور اگر موت کے بعد کوئی اور دنیا ہے تو وہ ان قوانین کے دائرۂ عمل سے باہر ہے، موجودہ زندگی میں ہمارا ہر شعوری وقت اور فاصلہ کے قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے، لیکن اگر فرائڈ کے نظریے کے مطابق ہماری کوئی ذہنی زندگی

ایسی ہے جوان قوانین کی پابندی سے آزاد ہے تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ہماری یہ زندگی موت کے بعد بھی جاری رہے گی، ہم موت کے بعد بھی زندہ رہیں گے ہماری موت خود فاصلہ اور وقت کے قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے، چونکہ ہماری اصل ہستی یا فرائڈ کے الفاظ میں ہمارا لاشعور ان قوانین کے عمل سے آزاد ہے، اس لئے ظاہر ہیکہ موت اس پر وارد نہیں ہوتی، بلکہ صرف جسد عنصری پر وارد ہوتی ہے، لاشعور جو اصل انسان ہے، وہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔۔۔ مثلاً ایک واقعہ جو ۲۵ سال پہلے گزرا تھا۔۔۔ یا ایک خیال جو میرے ذہن میں ۲۰ سال پہلے آیا تھا، اور اب میں اسے بالکل بھول چکا تھا، اس کو آج میں خواب میں دیکھتا ہوں، نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حافظہ (لاشعور) کے خانے میں بجنسہ موجود تھا، اب سوال یہ ہے کہ یہ حافظہ کہاں ہے، اگر وہ خلیوں کے اوپر ثبت تھا، جیسے گراموفون کے ریکارڈ کے اوپر آواز ثبت رہتی ہے، تو وہ خلیے جو ۲۵ سال پہلے ان خیالات کا ریکارڈ بنے تھے، وہ بہت پہلے ٹوٹ کر اور مردہ ہو کر میرے جسم سے نکل گئے اب نہ ان خلیوں کا بحیثیت خلیہ کہیں وجود ہے، اور نہ ان سے میرا کوئی تعلق ہے، پھر یہ خیال میرے جسم کے کس مقام پر تھا، یہ ایک تجرباتی شہادت اس بات کی ہے کہ جسم کے ماورا ایک اور دنیا ہے، جو بذات خود اپنا وجود رکھتی ہے، جو جسم کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوتی۔

۳۔ اسی طرح سائی کیکل تحقیقات (psychical research.) کے نتائج جو سامنے آئے ہیں وہ بھی خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں، اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے زندگی کو ثابت نہیں کرتے، بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں، جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذات خود تو پہلے سے موجود تھیں مگر

ان پر سائنسی انداز سے غور وفکر نہیں ہوا تھا، مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے، مگر جدید دور میں خواب کے مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم کئے گئے ہیں، ان سے قدیم دور کے لوگ نا آشنا تھا، اسی طرح کچھ اور مظاہر ہیں، جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد وشمار جمع کئے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا، اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں، اسی میں سے ایک سائی کیکل ریسرچ ہے، جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے، اور جس کا مقصد انسان کی مافوق العدات صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے، اس قسم کی تحقیقات کیلئے سب سے پہلا ادارہ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور ۱۸۸۹ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کرکے وسیع پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کردیں یہ اب بھی مطالعہ نفسیا تک کا ادارہ (society for psychical reseatch.) کے نام سے موجود ہے، اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کررہے ہیں، ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آڈر نوٹ کررہا تھا کہ ''یکا یک'' وہ لکھتا ہے ''مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے، میں نے تیزی سے مڑکر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے'' اس کی یہ بہن نو سال پہلے مرچکی تھی، کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہوگیا، مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کی بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (st.louis.) واپس ہوگیا، گھر آکر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزاء کو بتائی، جب وہ کہتے کہتے اس جملہ پر پہنچا کہ ''میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سرخ رنگ کی

ایک روشن خراش دیکھی'' تو اس کی ماں یکا یک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑ یہوگئی اور اس نیبتایا کہ لڑکی کی موتکے بعد ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی، اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا، اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹا دیئے اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔''

human personalityand its survival of bodily death,by f.w.h.myers(n.y.1903,)vol.11p.27-30.

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں، جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اس طرح کے واقعات کو وہم وخیال نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو، تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں، جن کو خودکار (automatists.) کہا جاتا ہے، یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں، جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے، ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والے کے سامنے چند ایسے جزئی واقعات پیش کرتا ہے، جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے، اور چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے، اور اسی کے ساتھ ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے، جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت اطلاع نہیں ہوتی جب تک کہ وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے، گویا اس کیاندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے، جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

(A philosophical scrutiny of religiom,p.407-10.)

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے، سی، ڈی،

براڈ (c.d.broad.) لکھتا ہے۔

''سائی کیکل ریسرچ کے مشتبہ استثناء کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔''

Religion, philosophy and psychical research (london 1953,)p,235.

مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے، جیسے کہا جائے کہ ''سوچنا'' ایک مشتبہ فعل ہے، کیونکہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا جو ''سوچنے'' کے مظہر کی تصدیق کرتا ہو، ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، اس لئے نفسیات ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا، کسی اور سائنس میں اس کی تصدیق طلب کی جائے یہی نہیں بلکہ خود انسان کے جسمانی حصے کے مطالعہ کو بھی اس کی تصدیق اتردید کے لئے بنیاد بنایا نہیں جا سکتا کیونکہ جس چیز کی بقا کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے، جو جسم سے ما سوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ دوسرے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی، جے، ڈوکاس (G.J.ducasse.) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے، پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے، مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے، اس باب کیآخری حصے میں وہ سائی کیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں۔

''کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ بالآخر

اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم شواہد ایسے ضرور ہیں، جن میں صرف بقائے روح کا فیضہ (survival hypothesis.) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے، ان کی دوری کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی، اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

الفرڈ رسل ویلس (alfred russel wallace.)

سر ولیم کروکس (sir william croores.)

ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس (f,w,h.myers.)

کیسر لومبراسو (cesar lombroso.)

کیمل فلیمیرین (camille flammarion.)

سر اولیور لاج (Sir oliver lodge.)

ڈاکٹر رچرڈ ہاگسن (DR.richard hodgson.)

مسز ہنری سڈوک (mrs.henry sidgwick.)

پروفیسر ہیلوپ (professor hyslop.)

اس معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں، صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے، جس کو تجرباتی دلیل (empirical proof.) سے ثابت کیا جا سکتا ہے، اور اگر ایسا ہے تو قطع نظر اس مبحث کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے، قطعی معلومات بالآخر اس کے بارے میں حاصل ہو سکیں گی، مگر ایسی صورت میں اس کی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔''

A philosophical scrutiny of religion,p.412.

یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلق مذہب عقیدے کو ماننا ایسا ہی ہ، جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کریں، اس کے بعد اس کے ایک عزیز

کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے ریسیور اس کے کان پر لگا دیا جائے، مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے۔۔۔ ''کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو ممکن ہے، کوئی مشین بول رہی ہو۔''

.....

فٹ نوٹ:۔

صفحہ نمبر ۹۲۔ جوانی کی مدت کو بڑھانے اور بڑھاپے کو موخر کرنے میں۔

صفحہ نمبر:۔۱۹۵۔۱ religion and the scientific outlook,

۲۔ خلیہ کو ''اینٹ'' یہاں محض ظاہری مشابہت کی بنا پر کہا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خلیہ ایک نہایت پیچیدہ مرکب ہے جو بذات خود ایک مکمل جسم رکھتا ہے، اور اس کے مطالعہ کے لئے ایک علیحیدہ سائنس وجود میں آ چکی ہے جس کا نام'' cytology.'' ہے۔

صفحہ نمبر:۔۱۰۷ the limitations of science,p.9.

صفحہ نمبر ۱۱۵:۔ story of philosophy,(n.y.1954)p.279.

صفحہ نمبر ۱۲۲:۔ اس طرح کے واقعات محض یورپ اور امریکہ کی خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ دنیا کی ہر آبادی میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں چونکہ موجودہ زمانے کی بیشتر تحقیقات یورپ اور امریکہ ہی کے جغرافیہ میں ہوئی ہیں، اس لئے علمی شہادتوں کے سلسلے میں عموماً انھیں کا ذکر آتا ہے۔ اگر کچھ با حوصلہ لوگ ہمارے علاقے میں اس کام کو شروع کریں تو کثرت سے نہایے معتبر اور قوی شہادتیں فراہم ہو سکتی ہیں، مجھے ذاتی طور پر خود بھی بعض ایسے واقعات کا علم ہے جو اس سلسلے میں نہایت حیرت انگیز شہادت فراہم کرتے ہیں۔۔ افسوس کہ ہماری قوم میں نہ تو کسی کو اس طرح کے کاموں میں سرمایہ لگانے کا جذبہ ہے اور نہ اپنا وقت دینے کا۔

اثبات رسالت

خدا کے بعد مذہب کا دوسرا عقیدہ رسالت یا وحی والہام ہے یعنی یہ عقیدہ کہ خدا انسانوں میں سے کسی انسان پر اپنا کلام اتارتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے تمام انسانوں کو اپنی مرضی سے باخبر کرتا ہے، اب چونکہ بظاہر ہمیں خدا اور صاحب وحی کے درمیان ایسا کوئی ''تار'' نظر نہیں آتا جس پر خدا کا پیغام سفر کر کے انسانوں تک پہونچتا ہو، اس لئے بہت سے لوگ اس دعوے کے صحیح ہونے سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنے معلوم حقائق کی مدد سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے گرد وپیش ایسے واقعات موجود ہیں، جو ہمارے محدود دائرہ سماعت سے کہیں بالاتر ہیں، مگر اس کے باوجود انھیں اخذ کیا جا سکتا ہے، انسان نے آج ایسے آلات ایجاد کر لئے ہیں جن سے وہ ایک مکھی کے چلنے کی آواز میلوں دور سے اس طرح سن سکتا ہے جیسے وہ اس کے کانکے پردے پر رینگ رہی ہو، حتیٰ کہ وہ کائناتی شعاعوں (cosmic rays.) کے تصادم تک کو ریکارڈ کر لیتا ہے، اس طرح کے آلات اب کثرت سے انسان کو حاصل ہو چکے ہیں، جو ثابت کرتے ہیں کہ اخذ و سماعت کی ایسی صورتیں بھی ممکن ہیں جو معمولی حواس کے ذریعے ایک شخص کے لئے ناممکن اور نا قابل قیاس ہوں۔

پھر یہ مخصوص ذرائع ادراک صرف مشینی آلات تک محدود نہیں بلکہ حیوانوں کا مطالعہ بتاتا ہے، کہ فطرت نے خود ذی حیات اشیاء کتا ندر ایسی طاقتیں رکھی ہیں،، بے شک عام انسان کے حواس بہت محدود ہیں مگر جانوروں کیحواس کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کتا اپنی متجسس ناک سے اس جانور کی بو سونگھ لیتا ہے، جو راستہ سے نکل گیا، چنانچہ کتے اس صلاحیت کو جرائم کی تفتیش میں استعمال کیا جاتا ہے، چور جس تالے کو توڑ کر کمرے میں گھسا ہے، اس تالے کو جاسوسی کتے (scott

dog.) کو سونگھایا جاتا ہے، اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ سینکڑوں انسانوں کے درمیان ٹھیک اس شخص کو تلاش کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، جس نے اپنے ہاتھ سے تالے کو چھوا تھا، کتنے جانور ہیں، جو ایسی آوازیں سنتے ہیں، جو ہماری قوت سماعت سے باہر ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جانوروں میں اشراق (telepathy.) کی صلاحیت پائی جاتی ہے، ایک مادہ پتنگے (moth) کو کوٹھے میں کھلی کھڑکی کے پاس رکھ دیجئے، وہ کچھ مخصوص اشارے کرے گی، یہ اشارے اسی نوع کے پتنگے حیرت انگیز فاصلے سے سن لیں گے اور اس کا جواب دیں گے، چھینگر اپنے پاؤں پر یا پر ایک دوسرے پر رگڑتا ہے، رات کے سناٹے میں آدھے میل دور تک یہ آواز سنائی دیتی ہے، یہ چھ سوٹن ہوا کو ہلاتا ہے، اور اس طرح اپن جوڑے کو بلاتا ہے، اس کی مادہ جو بظاہر بالکل خاموش ہوتی ہے، مگر پراسرار طریقہ پر کوئی ایسا بے آواز جواب دیتی ہے جو نر تک پہنچ جاتا ہے، نر اس پراسرار جواب کو جسے بھی نہیں سنتا، حیرت انگیز طور پر سن لیتا ہے، اور ٹھیک اسی سمت میں اس مقام پر جا کر اس سے مل جاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک معمولی ٹڈے (Grasshopper.) کی قوت سماعت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے نصف قطر کے برابر کی حرکت تک کو وہ محسوس کر لیتا ہے۔

اس طرح کی کثیر مثالیں موجود ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ ایسے ذرائع مواصلات ممکن ہیں جو بظاہر نظر نہ آتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ بطور واقعہ موجود ہوں اور مخصوص حواس رکھنے والے ذی حیات اس کا ادراک کر لیتے ہوں، ان حالات میں اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''مجھے خدا کی طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں، جن کو عام لوگ نہیں سنتے'' تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، اگر اس دنیا میں ایسی آوازیں ممکن ہیں، جو آلات سنتے ہوں، اگر یہاں ایسی پیغام رسانی ہو رہی ہے

جس کو ایک مخصوص جانور تو سن لیتا ہے، مگر دوسرا اسے نہیں سنتا تو آخر اس واقعہ میں استبعاد کا کیا پہلو ہے کہ خدا اپنی مصالح کے تحت بعض مخفی ذرائع سے ایک انسان تک اپنا پیغام بھیجتا ہے، اور اس کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کو اخذ کر سکے اور اس کو پوری طرح سمجھ کر قبول کر لے، حقیقت یہ ہے کہ وحی والہام کے تصور اور ہمارے مشاہدات کی ایک مخصوص صورت ہے، جس کا مختلف شکلوں میں ہم تجربہ کر چکے ہیں، یہ ایک امکان کو واقعہ کی صورت میں تسلیم کرنا ہے، پھر اشراق اور غیب دانی کے تجربات بتاتے ہیں کہ یہ چیز صرف حیوانوں تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر بھی بالقوہ اس قسم کی خصوصیات موجود ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں 'فرد کی نفسیاتی سرحدیں مکاں اور زماں کے اندر محض فرضی (suppositions.) ہوتی ہیں'' (ص ۲۴۴) چنانچہ ایک عامل کسی آواز اور خارجی ذریعہ کے بغیر اپنے معمول پر توجہ ڈالتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اس پر مصنوعی نیند (Hypnotic sleep.) طاری کر سکتا ہے، اس کو ہنسا یا رلا سکتا ہے، اس کے ذہن میں مخصوص خیالات القاء کر سکتا ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نہ کوئی ظاہری آلہ استعمال ہوتا اور نہ عامل اوع معمول کے سوا کوئی شخص اسے محسوس کرتا، پھر اسی نوعیت کا واقعہ بندے اور خدا کیدرمیان کیوں ہمارے لئے نا قابل تصور ہو خدا کو ماننے اور انسانی زندگی میں اشراقی قوت کا تجربہ کر لینے کے بعد ہمارے وحی والہام سے انکار کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

دسمبر ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے، بوریا کے حکام نے ایک وی آئی عامل توجہ (hypnotist.) ۔ فرنتر سٹروبل پر ریڈیو پروگرام میں ''خلل اندازی بذریعہ ٹیلی پیتھی'' کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا، رتجتا ہوٹل واقع میونخ میں اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے ہوئیسٹروبل نے ایک تماشہ بین کو تاش کا ایک پتہ اٹھا کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کا نام حسب منشا ترتیب کے ساتھ اپنے دل میں سوچ لے، ہپنا

ٹسٹ نے دعویٰ کیا کہ وہ اس پتے کا نام مع ترتیب (جیسا کچھ پتہ اٹھانے والے نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا) خود جانے بغیر ریڈیو کے اس اناونسر کی جانب منتقل کردے گا، جو اس وقت ریڈیو پر خبریں سنا رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد حیرت زدہ سامعین نے میونخ ریڈیو کے اناؤنسر کی لڑکھڑاتی زبان میں سنا۔ ''ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ'' پتے کا نام درست تھا، اور ترتیب بھی پتہ اٹھانے والے کی سوچ کے عین مطابق تھی۔

اناؤنسر کی وحشت اس کی آواز سے واضح ہو رہی تھی، تاہم وہ خبریں سنائے چلا گیا، ادھر سینکڑوں ریڈیو سننے والے اس عجیب واقعہ کا سبب معلوم کرنے کے لئے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کو ٹیلی فون کر رہے تھے، کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خبروں کے پروگرام کے درمیان ''ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ'' کے الفاظ کا کیا مطلب ہے، ڈاکٹر معائنہ کے لئے آیا تو اس نے پایا کہ اناؤنسر شدید اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے، اناؤنسر نے بتایا کہ خبریں پڑھتے پڑھتے اس کے سر میں اچانک درد سا اٹھا، اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

میں کہوں گا کہ اگر انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک انسان کے خیالات دوسرے انسان کو بعینہٖ منتقل کردے، جب کہ دونوں کے درمیان غیر معمولی فاصلہ ہو اور اس کے لئے کوئی ظاہری واسطہ استعمال نہ کیا گیا ہو تو القائے کلام کا یہی واقعہ خالق کائنات کی طرف سے کیوں وجود میں نہیں آ سکتا، انسانی صلاحیت کا یہ اظہار جس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، یہ ایک تجرباتی قرینہ ہے، جس سے ہم اس امکان کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کے بغیر کس طرح الفاظ اور معانی کا تعلق قائم ہوتا ہے، اور ایک کے خیالات دوسرے کو بعینہٖ منتقل ہو جاتے ہیں، اشراقی پیغام رسانی جو بندوں کے درمیان ایک معلوم اور ثابت شدہ واقعہ ہے، ایک ایسا قرینہ ہے جس سے ہم اس اشراق کو سمجھ سکتے ہیں، جو بندے اور

خدا کے درمیان ہوتا ہے، اور جس کی کامل اور متعین صورت کو مذہب کی اصطلاح میں ''وحی'' کہا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وحی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کا ایک مخصوص کائناتی اشراق ہے جس کا تجربہ محدود پیمانے پر ہم انسانی زندگی میں بار بار کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

وحی والہام کو ممکن بنانے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں کہ خدا کسی انسان سے مخاطب ہو اور اس کے ذریعہ سے اپنا کلام بھیجے، اس کی ضرورت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول آدمی کو جس چیز سے باخبر کرتا ہے، وہ آدمی کی شدید ترین ضرورت ہے، مگر وہ خود اپنی کوشش سے اسے حاصل نہیں کر سکتا ہزاروں برس سے انسان حقیقت کی تلاش میں ہے، وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، انسان کا آغاز و انجام کیا ہے، خیر کیا ہے، اور شر کیا ہے، انسان کو کیسے قابو میں لایا جائے، زندگی کو کیسے منظم کیا جائے کہ انسانیت کے سارے تقاضے اپنے صحیح مقام کو پاتے ہوئے متوازن ترقی کر سکیں، مگر ابھی تک اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی، تھوڑی مدت کی تلاش وجستجو کے بعد ہم نے لوہے اور پٹرول کی سائنس بالکل ٹھیک ٹھیک جان لی اور اس طرح طبیعی دنیا کی سینکڑوں سائنسوں کے بارے میں صحیح ترین واقفیت حاصل کر لی، مگر انسان کی سائنس ابھی تک اپنے موضوع کی ابتدائیات کو بھی متعین نہ کر سکی، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں ہمیں خدا کی مدد کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم اپنا ''دین'' معلوم نہیں کر سکتے۔

یہ بات انسان جدید کو تسلیم ہے کہ زندگی کا راز ابھی تک اس کو معلوم نہ ہو سکا، مگر اسی کے ساتھ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اس راز کو معلوم کر لے گا، سائنس اور صنعت کے پیدا کئے ہوئے ماحول کا انسان کے لئے سازگار نہ ہونا اسی وجہ سے ہے کہ ''اگر ایک طرف جامد مادے کے علوم کی وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی ہے تو دوسری

طرف جاندار ہستیوں کے علوم بالکل ابتدائی حالت پر باقی ہیں'' اس دورے شعبہ پر جن لوگوں نے کام کیا، وہ حقیقت کو نہ پا سکے، اور اپنے تخیلات کی دنیا میں بھٹک رہے ہیں، نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل (alexis carrel.) کے الفاظ میں:۔

''فرانسیسی انقلاب کے اصول اور مارکس اور لینن کے نظریے محض ذہنی اور قیاسی انسانوں پر منطبق ہو سکتے ہیں،

اس بات کو صاف طور پر محسوس کرنا چاہیے کہ انسانی تعلقات کے قوانین (law of human relation.) اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں، سماجیات اور اقتصادیات کے علوم محض قیاسی ہیں اور نا قابل ثبوت ہیں۔''

man the unknown,p.37.

بلاشبہ موجودہ زمانے میں علوم نے بہت ترقی کی ہے، مگر ان ترقیات نے مسئلہ کو اور الجھا دیا ہے، اس نے کسی بھی درجہ میں اس کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کی ہے، جے، ڈبلیو، این سولیون (J.W.N. sullivan.) لکھتا ہے۔

سائنس نے موجودہ زمانے میں جس کائنات کو دریافت کیا ہے، وہ تمام فکری تاریخ کے مقابلے میں بہت زیادہ پراسرار ہے، اگرچہ فطرت کے بارے میں ہماری معلومات تمام پچھلے ادوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں، مگر اس کے باوجود یہ کثیر معلومات ایک اعتبار سے بہت کم تشفی بخش ہیں۔۔۔ کیونکہ ہر سمت میں ہم ابہام (ambiguities.) اور تضاد (contradictions.) سے دو چار ہو رہے ہیں۔''

limitations of science,p.1.

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لئے نا قابل دریافت ہے ایک طرف صورحال یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے، اس کے بغیر ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے، ہمارے

بہترین جذبات اسے جاننا چاہتے ہیں، ہماری ہستی کا اعلیٰ ترین جزو جس کو ہم فکر یا ذہن کہتے ہیں، وہ اس کے بغیر مطمئن ہونے کے لئے کسی طرح راضی نہیں، ہماری زندگی کا سارا نظام اس کے بغیر ابتر ہے اور لاینحل معمہ بنا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے مگر یہی سب سے بڑی ضرورت ہم خود سے پوری نہیں کر سکتے۔

کیا یہ صورحال اس بات کی کافی دلیل نہیں کہ انسان ''وحی'' کا محتاج ہے، زندگی کی حقیقت کا انتہائی ضروری ہونے کے باوجود انسان کے لئے ناقابل دریافت ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا انتظام اسی طرح خارج کیا جانا چاہیے، جیسے روشنی اور حرارت انسان کے لئے ناگزیر ہونے کے باوجود اس کے اپنے بس سے باہر ہے، مگر قدرت تحیر انگیز طور پر سورج کے ذریعہ اس کا انتظام کر دیا ہے۔۔۔(اس مسئلہ پر مزید مواد اگلے باب میں ملے گا)

وحی والہام کو ممکن اور ضروری تسلیم کر لینے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ جو شخص اس کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ فی الواقع صاحب وحی ہے یا نہیں، ہمارے عقیدے اور ایمان کے مطابق اس قسم کے صاحبان وحی بہت کثیر تعداد میں اس زمین پر پیدا ہو چکے ہیں، مگر اس باب میں ہم خاص طور پر آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت پر گفتگو کریں گے اس لئے کہ آپ کے دعوئے نبوت کا ثابت ہونا دراصل سارے انبیاء کے دعوے نبوت کا ثابت ہونا ہے، کیونکہ آپ دیگر انبیاء کے منکر نہیں ہیں، بلکہ ان کی تصدیق کرنے والے ہیں اور اس لئے بھی کہ اب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے آپ ہی خدا کے رسول ہیں آپ ؐ کے بعد اب کوئی دوسرا رسول آنیوالا نہیں ہے، اس لئے عملاً اب نسل انسانی کی نجات وخسران کا معاملہ آپ ہی کے دعوے نبوت کو ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہے۔

سن عیسوی کے لحاظ سے ۲۹ اگست 570ء کی صبح کو مکہ میں ایک بچہ پیدا ہوا،

چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ خدا نے مجھ کو اپنا آخری رسول بنایا ہے، اور میرے پاس اپنا پیغام بھیج کر مجھے اس خدمت کیلئے مامور کیا ہے کہ میں اس کے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچادوں، جو میری اطاعت کرے گا وہ خدا کے یہاں سرفراز ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ ہلاک کردیا جائے گا۔

یہ آواز آج بھی پوری شدت کے ساتھ گونج رہی ہے، یہ ایسی آواز نہیں ہے کہ کوئی شخص اس کو سنے اور نظر انداز کردے بلکہ یہ ایک زبردست مطالبہ ہے، اس آواز کو مطالبہ ہے کہ ہم اس کے اوپر غور کریں، اس کے بعد اگر اس کو غلط پائیں تو کھلے دل سے اسے رد کردیں اور صحیح پائیں تو کھلے دل سے اس کو قبول کرلیں

کسی چیز کے علمی حقیت بننے کے لئے اسے تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے

۱۔مفروضہ(hypothesis.)

۲۔مشاہدہ(observation.)

۳۔تصدیق(verification.)

پہلے ایک مفروضہ ذہن میں آتا ہے، پھر مشاہدہ کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہو جائے تو اس مفروضہ کو واقعہ تسلیم کرلیا جاتا ہے، اس ترتیب میں کبھی فرق بھی ہو جاتا ہے، یعنی پہلے کچھ مشاہدات سامنے آتے ہیں، اور اس مفروضہ کو واقعہ تسلیم کرلیا جاتا ہے، اس ترتیب میں کبھی فرق ہو جاتا ہے، یعنی پہلے کچھ مشاہدات سامنے آتے ہیں، اور ان مشاہدات سے ایک تصور یا مفروضہ ذہن میں قائم ہوتا ہے پھر جب یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مشاہدات اس کی تصدیق کررہے ہیں تو وہ حقیقت قرار پاجاتا ہے۔

اس اصول کے مطابق نبی کا دعوئے نبوت گویا ایک "مفروضہ" کے طور پر ہمارے سامنے ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشاہدات اس کی تصدیق کررہے ہیں یا نہیں، اگر مشاہدات اس کے حق میں گواہی دے دیں تو اس کی حیثیت ایک مصدقہ

حقیقت (verfied fact.) کی ہو جائے گی، اور ہمارے لئے ضروری ہو جائے گا کہ ہم اس کو تسلیم کریں۔

اب دیکھئے کہ وہ کیا مشاہدات ہیں جو اس ''مفروضہ'' کی تصدیق کے لئے درکار ہیں جن کی بنا پر ہم نبی کے دعوے کو جانچیں اور اس کے مطابق دعوے کا صحیح یا غلط ہونا معلوم کریں، دوسرے لفظوں میں وہ کون سے خارجی مظاہر ہیں جن کی روشنی میں یہ متعین ہوتا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے رسول تھے، ذات رسول جمع ہونے والی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی توجیہہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم ان کو خدا کا رسول مانیں، میرے نزدیک یہ حسب ذیل ہیں جو شخص اپنے بارے میں رسول ہونے کا دعویٰ کرے، اس کے اندر دو خصوصیات لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔

۱۔ ایک یہ کہ وہ غیر معمولی طور پر ایک معیاری انسان ہو، کیونکہ وہ شخص جس کو ساری نسل انسانی میں اس لئے چنا جائے کہ وہ خدا سے ہم کلام ہو اور زندگی کی درستگی کا پروگرام اس کے ذریعہ سے منکشف کیا جائے یقینی طور پر اس کو نسل انسانی کا بہترین فرد ہونا چاہیے اور اس کی زندگی میں اس کے آدرشوں (ideals.) کو بہ تمام و کمال ظہور کرنا چاہیے، اگر اس کی زندگی ان اوصاف سے مزین ہے تو یہ اس کے دعوے کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، کیونکہ اس کا دعویٰ اگر غیر حقیقی ہو تو وہ زندگی میں اتنی بڑی حقیقت بن کر نمایاں نہیں ہو سکتا کہ اس کو اخلاق و کردار میں ساری انسانیت سے بلند کر دے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اس شخص کا کلام اور پیغام ایسے پہلوؤں سے بھرا ہوا ہونا چاہیے جو عام انسان کے بس سے باہر ہو جس کی امید کسی ایسے انسان سے کی جا سکتی ہو جس پر مالک کائنات کا سایہ پڑا ہو، عام انسان ایسا کلام پیش کرنے پر قادر نہ ہو سکیں۔

یہ دو معیار ہیں جن پر ہمیں رسول کے دعوے نبوت کا جانچنا ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں تاریخ کی قطعی شہادت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یک غیر معمولی سیرت کے آدمی تھے، ہٹ دھرمی کے ذریعہ تو کسی بھی حقیقت کا انکار ممکن نہیں، اور دھاندلی کی زبان میں ہر الٹی بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، یہ منظر ہم خود اپنے ملک میں دیکھ چکے ہیں کہ کمیونسٹ چین نے صحیح طور پر ہندوستانی سرحد کی خلاف ورزی کی اور جب احتجاج کیا گیا تو الٹا اس نے ہندوستان کے اوپر الزام لگانا شروع کر دیا کہ وہ اس کی سرحد کے اندر گھس آیا ہے، ہندوستان کے نام حکومت چین کا خط جو جنوری ۱۹۶۰ء میں شائع کیا گیا اس میں ہندوستانی سرحد کے اندر واقع دو لاکھ تیس ہزار مربع کیلومیٹر پر چین کا حق جتایا گیا ہے اور چینی وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ چینی فوجوں کی پیش قدمی چین کے علاقے سے ہندوستانی فوجوں کو پیچھے دھکیلنے کیلئے عمل میں آئی ہے، مگر جو شخص اس قسم کے تعصب کا مریض نہ ہو اور کھلے دل سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ لازماً تسلیم کرے گا کہ آپ کی زندگی اخلاقی حیثیت سے نہایت اعلیٰ وارفع تھی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال میں نبوت ملی، اس سے پہلے آپ کا پورا دور اخلاقی لحاظ سے اس قدر ممتاز تھا کہ آپ کو لوگ سچا اور دیانت دار کہہ کر پکارنے لگے تھے ''الصادق الامین'' آپ کا مشہور لقب بن گیا تھا، آپ کے متعلق یہ بات ساری آبادی میں متفق علیہ تھی کہ آپ ایک نہایت ایمان دار شخص ہیں، اور کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

دعوئے نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا، جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجر اسود کو نئی تعمیر میں کون شخص اس کی جگہ پر نصب کرے، چار پانچ دن تک یہ اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ تلواریں چل جائیں، بالآخر طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص

کرے گا جو کل صبح کو سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو، دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے ''ھذا الامین رضینا'' (امین آ گیا ہم سب اس کے فیصلے پر متفق ہیں)
(بخاری، باب ماذکر فی الحجر الاسود)

ہمیں تاریخ میں کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس کی زندگی بحث ونزاع کا موضوع بننے سے پہلے چالیس سال جیسی لمبی مدت تک لوگوں کے سامنے رہی ہو اور اس کے جاننے والے اس کی سیرت وکردار کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں

پہلی بار آپ پر غار حرا میں وحی اتری تو یہ آپ کے لئے ایسا غیر معمولی واقعہ تھا جس کا پہلے آپ کو کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، آپ شدت احساس کے ساتھ گھر لوٹ آئے اور اپنی اہلیہ سے، جو آپ سے عمر میں بڑی تھیں اس واقعہ کا ذکر کیا، اہلیہ کا جواب تھا۔۔۔''اے ابو القاسم! خدا یقیناً آپ کی حفاظت کرے گا، کیونکہ آپ سچ بولتے ہیں، آپ دیانت دار ہیں، آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں، اور لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔'' ابو طالب آپ کے چچا تھے، ان کے سامنے آپ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ نہیں سکتا، مگر اس کے بعد جب انھیں اپنے لڑکے علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے معلوم ہوا کہ وہ آپ پر ایمان لا چکے ہیں تو ابو طالب نے کہا'' بیٹے تم اس کے لئے آزاد ہو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ محمد تم کو خیر کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں بلائیں گے۔'' (آئیڈیل پرافٹ صفحہ ۶۸)

نبوت ملنے کے بعد جب آپ نے پہلی بار کوہ صفا کے دامن میں لوگوں کو جمع کر کے اپنی دعوت پیش کی اس وقت آپ نے اپنی دعوتی تقریر شروع کرنے سے پہلے حاضرین سے یہ سوال کیا'' تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے'' جواب میں بالاتفاق یہ آواز آئی۔

ماجربنا علیك الا صدقا۔

تمھارے اندر ہم نے سچائی کے سوا کوئی بات کبھی نہیں دیکھی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسا ممتاز تاریخی ریکارڈ جس کی مثال کسی بھی شاعر فلسفی مفکر یا مصنف کے یہاں نہیں مل سکتی۔

جب آپ نے پیغمبری کا اعلان کیا تو مکہ کے لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے، ان کے لئے یہ سوال خارج از بحث تھا کہ آپ کو نعوذ باللہ جھوٹا یا جعل ساز سمجھیں، کیونکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے خلاف تھا، اس لئے انھوں نے کبھی آپ پر اس قسم کا الزام نہیں لگایا، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اس شخص کی عقل کھو گئی ہے، وہ شاعرانہ مبالغہ کر رہے ہیں، اور ان پر کسی کا جادو چل گیا ہے، ان پر جنات سوار ہیں، مخالفین نے یہ سب کچھ کہا مگر کسی کی یہ جرات نہ ہوئی کہ وہ آپ کی صداقت اور دیانت داری پر شبہ ظاہر کرے، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک شخص جس کی قوم اس کی دشمن ہو چکی ہے، اور وطن میں اس کا رہنا بھی اسے گوارا نہیں ہے، اس شخص کے بارے میں اس کی دشمن قوم کا حال تاریخ یہ بیان کرتی ہے۔

لیس بمکۃ احد عندہ شئی لیخیعلیہ الاوضعہ عندہ لما یعلم من صدقہ و امانتہ۔ (سیرت ابن حشام جلد ۲ ص ۹۸)

ترجمہ:۔ مکہ میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کے بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو اسے آپ کے پاس رکھ دیتا کیونکہ ہر ایک کو آپ کی سچائی اور دیانت داری کا یقین تھا۔

نبوت کے تیرھویں سال عین اس وقت جب آپ کے مخالفین آپ کا مکان گھیرے ہوئے کھڑے تھے، اور اس بات کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ باہر نکلتے ہی آپ کو قتل کر دیں گے، آپ گھر کے اندر اپنے نوجوان عزیز علی بن ابی طالب علیہ اسلام کو یہ وصیت کر رہے تھے کہ میرے پاس مکہ کے فلاں فلاں لوگوں کا مال امانت

رکھا ہوا ہے، میرے جانے کے بعد تم ان سب کا مال انھیں واپس کر دینا۔

نضر بن حارث جو آپ کا مخالف ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں قریش کے اندر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے کہا۔۔۔ ''قریش کے لوگو! محمد کی دعوت نے تم کو ایسی مشکل میں ڈال دیا ہے جس کا کوئی حل تمھارے پاس نہیں ہے، وہ تمھاری آنکھوں کے سامنے بچپن سے جوان ہوئے ہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمھارے درمیان سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ پسندیدہ شخص تھے، لیکن جب ان کے بال سفید ہونے کو آئے اور انھوں نے وہ کلام پیش کیا، جس کو تم سن رہے ہو تو اب تمھارا حال یہ ہے کہ تم کہتے ہو'' کہ یہ شخص جادوگر ہے، یہ شاعر ہے یہ مجنون ہے'' خدا کی قسم میں نے محمد کی باتیں سنی ہیں، محمد نہ جادوگر ہے، نہ وہ شاعر ہے، نہ وہ مجنون ہے' مجھے یقین ہے کہ کوئی اور مصیبت تمھارے اوپر آنے والی ہے (سیرۃ النبی لابن ہشام جلد ا ص ۳۱۹)

ابوجہل جو آپ کا چچا تھا اور آپ کا بدترین دشمن تھا، وہ کہتا ہے۔۔ 'محمد! میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹے ہو، مگر جس چیز کی تم تبلیغ کر رہے ہو وہ صحیح نہیں، اس کو میں غلط سمجھتا ہوں۔'' (ترمذی)

آپ کی نبوت چونکہ صرف عرب کے لئے نہیں تھی، بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی، اس لئے اپنی زندگی ہی میں آپ نے ہمسایہ ملک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کئے، روم کے بادشاہ ہرقل کو آپ کا دعوت نامہ ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ یہاں ہوں تو حاضر کئے جائیں، اسی زمانے میں قریش کے چند لوگ تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے۔ وہ دربار میں پہنچے تو ہرقل نے پوچھا تمھارے شہر میں جس شخص نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے کوئی اس کا قریبی رشتہ دار بھی ہے۔۔۔ ابوسفیان نے جواب دیا وہ میرے خاندان کا ہے، اس کے بعد ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

ہرقل ؛ کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ابوسفیان ؛ ابھی تک اس نے کسی عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔

ہرقل نے یہ سن کر کہا۔ ''جب یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ آدمیوں کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے معاملے میں اتنا بڑا جھوٹ گڑھ لیا ہو۔''

یہ اس وقت کی گفتگو ہے جب ابوسفیان ابھی ایمان نہیں لائے تھے، اور محمد مصطفیٰ کا کٹر دشمن تھا، بلکہ آپ کے خلاف جنگ کی قیادت کر رہا تھا وہ خود کہتے ہیں کہ ''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو دوسرے قریشی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ اس جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا۔''
(بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ)

ساری تاریخ میں کسی بھی ایسے شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کے مخاطبین شدید مخالف ہونے کے باوجود اس کی زندگی اور سیرت کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں، اور یہ واقعہ بجائے خود آپ کے رسول اللہ ہونے کا کافی ثبوت ہے، یہاں میں ڈاکٹر لیٹز کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

''میں بہت ادب کے ساتھ یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ اگر فی الواقعی خدایت پاک کے یہاں سے جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، الہام ہوتا ہے تو محمد کا مذہب الہامی مذہب ہے، اور اگر ایثار نفس، دیانت داری، راسخ الاعتقادی، نیکی اور بدی کی کامل جانچ اور برائی دور کرنے کے عمدہ ذرائع ہی الہام کی ظاہری بین علامتیں ہیں تو محمد کا مشن الہامی تھا۔''

Life of mohammad by m.abdulfazal.)

جب آپ نے دعوت دینی شروع کی تو آپ کی قوم سخت ترین مصیبتیں ڈالیں، آپ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھنے میں آپ کے جسم پر نجاست لا کر انڈیل دیتے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ ابن ابی معیط نے آپ

کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچا کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، اس قسم کی حرکتوں سے جب آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے آپ کا اور آپ کے سارے خاندان کا بائی کاٹ کر دیا اور آپ کو مجبور کیا کہ بستی کے باہر ایک پہاڑی درہ میں جا کر بے یار و مددگار پڑے رہیں، اس دوران میں کوئی ضرورت کی چیز حتیٰ کہ کھانا پینا بھی نہ کوئی شخص آپ تک پہونچا سکتا تھا، اور اور نہ آپ کے ہاتھ فروخت کر سکتا تھا۔۔۔ آپ اپنے خاندان کے ساتھ تین سال تک اس حصار میں اس طرح رہے کہ پہاڑی درخت (طلح) کے پتے کھاتے تھے، آپ کے ایک ساتھی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑہ ہاتھ آ گیا میں نے پانی سے اسے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا تین سال کے بعد یہ حصار ختم ہوا۔

مکہ یہ لوگوں کی یہ سنگ دلی دیکھ کر آپ طائف گئے جو مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر امراء و روسا کا شہر تھا، وہاں کے لوگوں نے آپ سے نہایت بری طرح کلام کیا، ایک نے کہا ''کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور پیغمبری کے لئے نہیں ملتا تھا'' پھر ان لوگوں نے بدکلامی ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ طائف کے اوباشوں کو ابھار کر آپ کے پیچھے لگا دیا، یہ لوگ ہر طرف سے آپ کے اوپر ٹوٹ پڑے اور آپ پر پتھر پھینکنا شروع کیا، انھوں نے اس بری طرح آپ کو زخمی کیا کہ جوتے خون سے بھر گئے، آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے جب چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالی بجاتے، اسی طرح شام ہونے تک آپ کے پیچھے لگے رہے، شام کو جب وہ زخم اور خون کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تو آپ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں کی آڑ میں پناہ لی یہی وہ واقعہ ہے جس کے متعلق آپ نے ایک مرتبہ عائشہ سے فرمایا ''لقد لقیت من قومک مالقیت وکان اشد مالقیت منھم یوم العقبۃ۔''

ان تمام ایذا رسانیوں کے باوجود آپ اپنا کام کرتے رہے، بالآخر قریش نے طے کیا کہ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایک رات کو قریش کے تمام سرداروں نے ننگی تلواروں کے ساتھ آپ کا مکان گھیر لیا تا کہ صبح کو جب آپ باہر نکلیں تو آپ کو قتل کر دیا جائے، مگر اللہ کی مدد سے آپ بحفاظت گھر سے نکل گئے اور مدینہ جا کر قیام فرمایا۔

اس کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ باضابطہ جنگ چھیڑ دی، اور دس سال تک مسلسل آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جدال وقتال میں الجھائے رکھا جس میں آپ کے دانت شہید ہوئے بہترین ساتھی مارے گئے، وہ تمام مصائب جھیلنے پڑے جو جنگی حالت پیدا ہو جانے کے بعد جھیلنے ہوتے ہیں۔

اس طرح کی ۲۳ سالہ تاریخ کے بعد آپ کی عمر کے آخری دنوں میں مکہ فتح ہوا، اس وقت آپ کے دشمن بے یار و مددگار آپ کے سامنے کھڑے تھے، ایسے وقت میں فاتح جو کچھ کرتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، مگر آپ نے ان سے کوئی انتقام نہیں لیا، آپ نے پوچھا: ''یا معشر قریش ماترون انی فاعل فیکم''؟ (قریش کے لوگو! بتاؤ اب تمھارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا، انھوں نے کہا آپ شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، آپ نے فرمایا:

اذھبو فانتم الطلقاء۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام مطبوعہ جلد ۴ صفحہ ۳۲)

اعلیٰ ترین سلوک کی یہ حیرت انگیز مثال تاریخ کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ اگر وہ دور تاریخ سے قبل کا ہوتا اور تاریخی طور پر ثابت نہ ہوتا تو یقیناً کہنے والے کہتے کہ یہ واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے کیونکہ کوئی انسان اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ (Bosworth smith) کے یہ الفاظ کس قدر صحیح ہیں:۔

''جب میں آپ کے جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت

مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے، اور کیا ہو گئے، آپ کے تابع دار
اور پیروؤں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی، کیا
کیا کارنامے دکھائے تو آپ مجھے سب سے بزرگ اور سب سے برتر
اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں۔"

(mohammad and mohammedanism.)

پھر آپ نے اپنی ساری زندگی میں جس بے غرضی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، منصب، رسالت سے پہلے آپ مکہ کے ایک کامیاب تاجر تھے اور آپ کا نکاح میں حجرت خدیجہ جیسی عرب کی دولت مند خاتون تھیں لیکن رسالت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ کی تجارت اور حجرت خدیجہؓ کی دولت دونوں ختم ہو گئیں، اور آپ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ آپ خود فرماتے ہیں۔ "مجھے خدا کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا نہیں گیا، مجھ پر تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لئے کھانا، جیسے کوئی جاندار کھا سکے، بس اتنی مقدار میں ہوتا تھا کہ بلال اسے بغل میں چھپا لیتے۔"

(مشکوۃ کتاب الرقاق)

آپ نے صرف اپنے مشن کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھائیں، ورنہ آپ کیلئے دوسری زندگی بھی ممکن تھی جب آپ مکہ میں تھے قریش کی طرف سے عتبہ یہ پیش کش لے کر آپ کی خدمت میں آیا کہ۔۔۔ "بھتیجے! اگر اس دعوت سے تم مال و دولت چاہتے ہو تو آؤ کہ ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مال دار بن جاؤ، اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو بتاؤ ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ تمھیں اپنا سردار مان لیں، اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے، لیکن اگر یہ واقعہ نہیں ہے، اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمھیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں تم دور نہیں کر سکتے تو ہم تمھارا علاج کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔"

عتبہ کی یہ تقریر آپ خاموشی سے سنتے رہے، اور اسکے بعد جو جواب دیا وہ یہ کہ

قرآن کی کچھ آیتیں پڑھ کر اسے سنا دیں۔ (سیرت ابن ہشام جلد ا ص ۳۱۴)

مدینہ میں آپ ایک ریاست کے مالک تھے، آپ کو ایسے جاں نثار خادم حاصل تھے کہ ان جیسے فادار اور جاں نثار ساتھی، آج تک کسی کو نہیں ملے گا، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ آخر عمر تک آپ نے بالکل معمولی حالت میں گزار دی۔

حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''میں آپ کے حجرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ بغیر تکیہ کے کھجور کی معمولی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں، اور آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آ رہے ہیں حجرہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس کا کل اثاثہ یہ تھا ایک طرف تین چمڑے، ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں تقریباً ایک صاع، جو یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا، آپ نے پوچھا روتے کیوں ہو، میں نے عرض کیا، قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے، اور آپ خدا کے رسول اس حالت میں ہیں، یہ سن کر آپ بیٹھ گئے اور فرمایا: عمر! آخر تم کس خیال میں ہو، کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے۔''

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا، عروہؒ نے پوچھا تو آپ لوگ زندہ کیسے رہتی تھیں، انھوں نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، ساتھ ہی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے، ان ہی کی دوسری روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ گھر والوں نے مسلسل تین دن گیہوں کا استعمال کیا ہو، اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے۔

آپ نے قدرت رکھنے کے باوجود اس طرح زندگی گزاری اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی بیویوں اور اولاد کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار نہ درہم، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی، اس کے بجائے دنیا کی عظیم ترین حکومت کے بانی جس کو اپنی زندگی میں یہ معلوم تھا کہ اس کی حکومت ایشیا اور افریقہ سے گزرتی

ہوئی یورپ کی سرحدوں تک پہنچ جائے گی، اس نے فرمایا۔

لا نورث ما ترکنا صدقہ۔

ہم (پیغمبروں) کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

(بخاری و مسلم)

آپ کیا خلاق و کردار اور آپ کیا خلاص و ایثار کی ایک جھلک جو اوپر پیش کی گئی، یہ کچھ مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہی آپ کی پوری زندگی ہے، آپ کی ساری زندگی اسی قسم کیواقعات کا دوسرا نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ ک انسانیت اتنی بلند تھی کہ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کبھی پیدا ہوسکتا۔

ایسے غیر معمولی انسان کے لئے یہ عجیب نہیں ہوگا کہ ہم اس کو خدا کا رسول مان لیں، بلکہ یہ عجیب ہوگا کہ ہم اس کے رسول ہونے کا انکار کردیں، کیونکہ آپ کو رسول مان کر ہم صرف آپ کی معجزاتی شخصیت کی توجیہہ کرتے ہیں، اگر ہم آپ کو رسول نہ مانیں تو ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں رہتا کہ ان حیرت انگیز اوصاف کا سرچشمہ کیا تھا، جب کہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ کے یہ الفاظ ایک لحاظ سے حقیقت واقعہ کا اعتراف ہیں، اور دوسرے لحاظ سے وہ سارے انسانوں کو آپ کی رسالتپر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں:۔

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لئے اسی منصب کا دعویٰ کیا جس سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اور میں یہ یقین کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپ ایک پیغمبر

تھے،خدا کے سچے پیغمبر۔"

(mohammad and mohammedanism,p.344.)

دوسرے پہلو سے رسول کی رسالت کا سب سے بڑا ثبوت وہ کتاب ہے جس کو اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ اس کے اوپر خدا کی طرف سے اتری ہے، یہ کتاب بے شمار ایسی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے، جو اس کے بارے میں اس امر کا قطعی قرینہ پیدا کرتی ہیں کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

یہ بحث چونکہ اہمیت کی حامل ہے، اس لئے اس کو میں الگ باب میں بیان کروں گا۔

.....

فٹ نوٹ:۔

صفحہ نمبر ۱۲۹:۔ غیب دانی اور اشراق کے ان ثابت شدہ مظاہر کی توجیہہ کے لئے مختلف نظریے پیش کئے گئے ہیں، مثلاً یہ دماغ سے کسی قسم کی لہریں نکلتی ہیں، جو نہایت تیزی سے عالم میں پھیل جاتی ہیں، چنانچہ اس کو نظریہ امواج دماغی (brain-wave theory) کہا جاتا ہے۔

religion,philosophy and physical resrarch by c.d.broad,p.47-48.

نیز ملاحظہ ہو کرالکسس کیرل کی کتاب صفحات ۴۹۔۲۴۴۔

فٹ نوٹ صفحہ نمبر ۱۳۱:۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب صفحات ۱۶۔۱۹۔

صفحہ نمبر ۱۳۸:۔ ہرقل (قیصر روم) ان دنوں ایرانیوں پر فتح یابی کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے بیت المقدس آیا ہوا تھا، وہیں اس کو خط ملا۔

قرآن۔۔خدا کی آواز

پیغمبر اسلام حجرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

''پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزات دیئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اور مجھ کو جو معجزہ عطا ہوا ہے، وہ قرآن ہے۔

(بخاری، باب الاعتصام)

یہ ارشاد ہماری تلاش کے صحیح رخ کو متعین کرتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ رسول کی رسالت پہچاننے کے لئے آج ہمارے پاس جو سب سے بڑا ذریعہ ہے وہ، وہ کتاب ہے کس کو رسول نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ وہ اس کیپاس خدا کی طرف سیاتری ہے، قرآن رسول کا نمایندہ بھی ہے، اور رسول برحق ہونے کی دلیل بھی۔

قرآن کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، یہاں میں چند پہلوؤں کا مختصراً ذکر کروں گا۔

ا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو قرآن کے طالب علم کو متاثر کرتی ہے، وہ قرآن کا چیلنج ہے، جو چودہ سو برس پہلے سے دنیا کے سامنے ہے، مگر آجتک اس کا جواب نہ دیا جا سکا، قرآن میں بار بار یہاعلان کیا گیا ہے، کہ جو لوگ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے بارے میں مشتبہ ہیں، اور اس کو محض اپنے جیسے انسان کی تصنیف سمجھتے ہیں، وہ ایسی ایک کتاب بنا کر پیش کریں، بلکہ اس کیجیسی ایک سورہ ہی بنا کر دکھادیں۔

وان کنتم فی ریبٍ مما نزلنا علیٰ عبدِنا فاتو ابسورۃٍ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔

ترجمہ:۔ اپنے بندے پر اپنا جو کلام ہم نے اتارا ہے، مگر اس کے (کلام الٰہی ہونے کے) بارے میں تمھیں شبہ ہے تو اس کے جیسی ایک سورہ لکھ کر لے آؤ اور خدا کے سوا اپنے تمام شہداء کو بھی بلا لو، اگر تم اپنے

خیال میں سچے ہو۔(بقرہ۔۲۳)

یہ ایک حیرت انگیز دعویٰ ہے، جو ساری انسانی تاریخ میں کسی بھیمصنف نے نہیں کیا اور نہبقید ہوش وحواس کوئی مصنف ایسا دعویٰ کرنے کی جرات کرسکتا، کیونکہ کسی بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھ دے جس کے ہم پایہ کتاب دوسرے انسان نہ لکھ سکتے ہوں، ہر انسانی تصنیف کے جواب میں اسی درجہ کی دوسری انسانی تصنیف تیار کی جاسکتی ہے،قرآن کا یہ کہنا کہ وہ ایک ایسا کلام ہے،جیسا کلام انسانی ذہن تخلیق نہیں کرسکتا،اور ڈیڑھ ہزار برس تک کسی انسان کا اس پر قادر نہ ہونا قطعی طور پر ثابت کردیتا ہے کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدائی منبع (divine origin.) سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور جو چیز خدائی منبع سے نکلی ہو اس کا جواب کون دے سکتا ہے۔

تاریخ میں چند مثالیں ملتی ہیں جب کہ اس چیلنج کو قبول کیا گیا، سب سے پہلا واقعہ لبید بن ربیعہ کا ہے جو عربوں میں اپنے قوت کلام اور تیزی طبع کے لئے مشہور تھا اس نے جواب میں ایک نظم لکھی جو کعبہ کے پھاٹک پر آویزاں کی گئی اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو صرف کسی اعلیٰ ترین شخص ہی کو ملتا تھا۔اس واقعہ کے جلد ہی بعد کسی مسلمان نیقرآن کی ایک سورہ لکھ کر اس کے قریب ہی آویزاں کردی،لبید (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے)جب اگلے روز کعبہ کے دروازے پر آئے اور سورہ کو پڑھا تو ابتدائی فقروں کے بعد ہی وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور اعلان کیا کہ بلا شبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اور میں اس پر ایمان لاتا ہوں ۔۔حتیٰ کہ عرب کا یہ مشہور شاعر قرآن کے ادب سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی شاعری چھوٹ گئی، بعد کو ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے اشعار کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا۔

''جب خدا نے مجھے بقرہ اور آل عمران جیسا کلام دیا ہے تو اب شعر

کہنا میرے لئے زیبا نہیں۔''

(استیعاب ابن عبد البر، ترجمہ لبید)

دوسرا اس سے زیادہ عجیب واقعہ ابن المقفع کا ہے جس کو نقل کرتے ہوئے ایک مستشرق (wollastion.) لکھتا ہے۔

that muhammad,s boast as to the literary excellence of the quran was not unfounded,is further evidenced by a circumstance, which occurred about a century after the establishment of aslam .(muhammad,his life and doctrines,p.143.)

یعنی یہ بات کہ قرآن کے اعجاز کلام کے بارے میں محمد کی شیخی غلط نہیں تھی، یہ اس واقعہ سے ثابت ہو جاتا ہے جو اسلام کے قیام کے سو سال بعد پیش آیا۔

واقعہ یہ ہے کہ منکرین مذہب کی ایک جماعت نے یہ دیکھ کر کہ قرآن لوگوں کو بڑی شدت سے متاثر کر رہا ہے، یہ طے کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے، انھوں نے اس مقصد کے لئے ابن المقفع (م ۷۲۷ء) سے رجوع کیا جو اس زمانے کا ایک زبردست عالم، بے مثال ادیب اور غیر معمولی ذہین و طباع آدمی تھا، ابن مقفع کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ راضی ہو گیا، اس نے کہا کہ میں ایک سال میں یہ کام کر دوں گا البتہ اس نے یہ شرط لگائی کہ اس پوری مدت میں اس کی تمام ضروریات کا مکمل انتظام ہونا چاہیے تا کہ وہ ماکل یکسوئی کے ساتھ اپنے ذہن کو اپنے کام میں مرکوز رکھے۔

نصف مدت گزر گئی تو اسکے ساتھیوں نے یہ جاننا چاہا کہ اب تک کیا کام ہوا ہے۔ وہ جب اس کے پاس گئے تو انھوں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ بیٹھا ہوا ہے۔ قلم اس کے ہاتھ میں ہے، گہرے مطالعہ میں مستغرق ہے، اس مشہور ایرانی ادیب کے سامنے ایک سادہ کاغذ پڑا ہوا ہے، اس کی نشست کے پاس لکھ لکھ کر پھاڑے ہوئے کاغذات کا ایک انبار ہے اور اسی طرح سارے کمرے میں کاغذات

کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس انتہائی قابل اور فصیح اللسان شخص نے اپنی بہترین وقت صرف کر کے قرآن کا جواب لکھنے کی کوشش کی، مگر وہ بری طرح ناکام رہا، اس نے پریشانی کے عالم میں اعتراف کیا کہ صرف ایک جملہ لکھنے کی جدوجہد میں اس کے چھ مہینے گزر گئے مگر وہ لکھ نہ سکا، چنانچہ نا امیدی اور شرمندہ ہو کر وہ اس خدمت سے دستبردار ہو گیا۔

اس طرح قرآن کا چیلنج بدستور آج تک قائم ہے اور صدیوں پر صدیاں گزر گئیں مگر کوئی اس کا جواب نہ دے سکا، قرآن یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے جو بلا اشتباہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مافوق ہستی کا کلام ہے، اگر آدمی کے اندر فی الواقع سوچنے کی صلاحیت ہو تو یہی واقعہ ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کی اس معجزانہ کلام کا نتیجہ تھا کہ عرب لوگ، جو فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور جن کو اپنے کلام کی برتری کا اتنا احساس تھا کہ عرب کیسوا بقیہ دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے، وہ قرآن کے کلام کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے، تمام لوگوں کو اس کے برتر ادب کا اعتراف کرنا پڑا، ضماد ازدی نام کے ایک عرب آپ کے پاس آئے، وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے، آپ نے انھیں قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا، وہ سن کر حیران رہ گئے، ان کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا۔

"خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی، جودوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں، مگر تمھارا کلام کچھ اور ہی ہے، یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا"۔

(مسلم، باب تخفیف الصلوۃ)

اسی طرح کے بے شمار اعترافات ہیں، جو قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں، اور حال کے واقعات میں بھی۔

۲۔ دوسری چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ قرآن کی پیشین گوئیاں ہیں،

یہ پیشین گوئیاں حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔

تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے ذہین اور حوصلہ مند لوگ ملتے ہیں جنھوں نے اپنے یا دوسرے کے بارے میں پیشین گوئی کی جرات کی ہے، مگر ہمیں معلوم ہے کہ زمانے نے کبھی ایسے لوگوں کی تصدیق نہیں کی، موافق حالات غیر معمولی صلاحیت، اعوان و انصار کی کثرت اور ابتدائی کامیابیوں نے اکثر لوگوں کو اس دھوکے میں ڈال دیا کہ وہ ایک ایسے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو عین اس کی مرضی کے مطابق ہے، انھوں نے فوراً ایک یقینی انجام کا دعویٰ کر دیا مگر تاریخ نے ہمیشہ اس قسم کے دعوؤں کی تردید کی ہے، اس کے برعکس بالکل مخالف اور نا قابل قیاس حالات میں بھی قرآن کے الفاظ اس طرح صحیح ثابت ہوئے کہ ان کی توجیہہ کے لئے تمام انسانی علوم بالکل نا کافی ہیں، ہم انسانی تجربات کی روشنی میں کسی طرح ان کو سمجھ نہیں سکتے، ان کی توجیہہ کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ان کو غیر انسانی ہستی کی طرف منسوب کیا جائے۔

نپولین بونا پارٹ اپنے وقت کا عظیم جنرل تھا، اس کی ابتدائی کامیابیاں بتاتی تھیں کہ وہ سیزر اور اسکندر کے لئے بھی ایک قابل رشک فاتح ثابت ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ وہ تقدیر کا مالک ہے، اس کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہو گیا کہ اپنے قریبی مشیروں تک کے مشورے کو قبول کرنا اس نے چھوڑ دیا، اس کا کہنا تھا کہ غلبہ کیسوا میرا کوئی دوسرا انجام نہیں ہو سکتا، مگر اس کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے، ۱۲ جون ۱۸۱۵ء کو نپولین اپنی سب سے بڑی فوج لے کر پیرس سے روانہ ہوا کہ دشمن کو اس کے راستے ہی میں ختم کر دے، اس کے چھ دن بعد واٹرلو (بلجیم) میں ڈیوک آف ولنگٹن (duke wellingtion.) نے خود اس کو فیصلہ کن شکست دینے میں کامیابی حاصل کی، جو اس وقت برطانیہ، ہالینڈ اور جرمنی کی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا، اب نپولین کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں، وہ

اپنا تخت چھوڑ کر امریکہ کے ارادے سے بھاگ کھڑا ہوا، مگر ابھی ساحل پر پہنچا تھا، کہ دشمن کے نگران دستوں نے اسے پکڑ لیا، اور اس کو مجبور کیا کہ وہ ایک برطانوی جہاز پر سوار ہو، اس کے بعد اس کو جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لئے جنوبی اٹلانٹک کے جزیرہ سینٹ ہیلینا پہنچا دیا گیا، جہاں وہ تنہائی اور تلخ حالات میں پڑا پڑا ۵۱ مئی ۱۸۲۱ء کو مر گیا۔

مشہور کمیونسٹ مینی فسٹو جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا، اس میں سب سے پہلے جس ملک میں اشتراکی انقلاب کی امید ظاہر کی گئی تھی، وہ جرمنی ہے، مگر ایک سو بیس (۱۲۰) سال گزرنے کے بعد بھی جرمنی اب تک اس ''انقلاب'' سے نا آشنا ہے، مئی ۱۸۴۹ء میں کارل مارکس نے لکھا تھا ''سرخ جمہوریت پیرس کے اوپر سے جھانک رہی ہے'' اس پیشین گوئی کو ایک صدی سے زیادہ مدت گزر گئی، مگر ابھی تک پیرس کے اوپر سرخ جمہوریت کا آفتاب نہیں نکلا، اڈولف ہٹلر نے ۱۴ مارچ ۱۹۳۶ء کو میونخ کی مشہور تقریر میں کہا تھا۔

''میں اپنے راستے پر اعتماد کے ساتھ چل رہا ہوں کہ غلبہ میرے حق میں مقدر ہو چکا ہے۔''

مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ جرمنی کے اس عظیم ڈکٹیٹر کے حق میں جو چیز مقدر تھی وہ یہ کہ وہ شکست کھائے اور خودکشی کر کے اپنی جان دے، خود اپنے ملک میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنوری ۱۹۵۴ء میں مدورا میں کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگرس کے موقع پر کمیونسٹ لیڈر مسٹر پی، سی، جوشی نے اعلان کیا تھا کہ ''ہندوستان کے آئندہ عام الیکشن میں کمیونسٹ پارٹی ٹراونکور، کوچن (کیرالا) مدراس، آندھرا، مغربی بنگال اور آسام میں اپنی وزارت بنالے گی۔'' اس کے بعد کئی الیکشن آئے اور چلے گئے۔ مگر حالات نے ان الفاظ کی تصدیق نہیں کی، اس طرح کی بے شمار مثالوں کے ہجوم میں صرف کتاب الٰہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے جس چیز کی پیشین گوئی کی

وہ حرف بہ حرف ہوری ہوئی ۔۔۔ یہ واقعہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ یہ کلام ایسے مافوق ذہن سے نکلا ہے جس کے قبضہ میں حالات کی باگ دوڑ ہے اور جو ازل سے ابد تک کی خبر رکھتا ہے۔

یہاں میں صرف دو پیشین گوئیوں کا ذکر کروں گا، ایک خود پیغمبر اسلام کا غلبہ، دوسرے رومیوں کی دوبارہ فتح کی پیشین گوئی۔

ا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی دعوت شروع کی تو تقریباً تمام عرب آپ کا مخالف ہو گیا ایک طرف مشرک قبائل تھے، جو آپ کے جانی دشمن ہو گئے تھے، دوسری طرف یہودی سرمایہ دار تھے، جو ہر قیمت پر آپ کو ناکام بنا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، تیسری طرف منافقین تھے، جو بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے، مگر ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی جماعت میں گھس کر آپ کی تحریک کو اندر سے ڈائنامیٹ کریں، اس طرح طاقت، سرمایہ اور اندرونی سازش ۔۔۔ سہ طرفہ مخالفوں کے طوفان میں آپ اس طرح اپنی تحریک چلا رہے تھے کہ تھوڑے سے غلاموں اور کمزور لوگوں کے سوا کوئی آپ کا ساتھی نہ تھا، مکہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے گنتی کے چند آدمی جو آپ کا ساتھ دینے کے لئے نکلے ان کا بھی حال یہ ہوا کہ آپ کی طرف آتے ہی وہ اپنی برادری سے کٹ گئے اور ان کی قوم ان کی بھی اسی طرح دشمن ہو گئی جس طرح وہ خدا کے رسول کی دشمن تھی۔

یہ تحریک یوں ہی چلتی رہی یہاں تک کہ حالات اس قدر شدید ہو گئے کہ آپ اور آپ کے ساتھی جو پہلے ہی نہتے اور کمزور تھے، مدینے میں اس حالت میں جمع ہوئے کہ اپنے وطن میں جو کچھ ان کے پاس تھا وہ بھی چھن چکا تھا، مدینے میں ان لوگوں کی بے کسی کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ میں آپ کے جو ساتھی جمع ہوئے تھے، ان میں سے ایسے لوگ بھی تھے، جن کے رہنے کے لئے کوئی باقاعدہ مکان نہیں تھا، وہ چھپڑ پڑے ہوئے ایک چبوترے پر

زندگی گزارتے تھے، اسی مناسبت سے ان کا نام ''اصحاب صفہ'' پڑ گیا تھا، اس چبوترے پر مختلف اوقات میں جو لوگ رہے، ان کی تعداد تقریباً چار سو بتائی جاتی ہے، حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں سے ہر شخص کا حال یہ تھا کہ اس کے پاس یا تو صرف ایک تہمند تھی یا پھر ایک چادر، وہ اس کو اپنی گردن میں باندھ لیتا تھا اور وہ اس کی پنڈلی تک لٹکتا رہتا تھا، حضرت ابو ہریرہ اس زمانے کا خود اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں خاموش لیٹا رہتا تھا، اور لوگ سمجھتے تھے کہ میں بے ہوش ہوں، حالانکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ فاقے کی وجہ سے نڈھال ہو جاتا تھا، اور مسجد میں جا کر لیٹ رہتا تھا (ترمذی)

چند انسانوں کا یہ بے سروسامان قافلہ مدینے کی زمین پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ ہر آن یہ خطرہ تھا کہ چاروں طرف اس کے پھیلے ہوئے دشمن اس کو اچانک لے جائیں گے، مگر خدا کی طرف سے بار بار آپ کو بشارت آتی تھی کہ تم ہمارے نمائندے ہو اور تمھیں کوئی زیر نہیں کر سکتا (کتب اللہ لاغلبن انا و رسلی) ساری مخالفتوں کے علی الرغم اللہ تم کو غالب کر کے رہے گا۔

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافوھم و اللہ متم نورہ و لو کرہ الکافرون ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔ (صف۔ ۸، ۹)

یعنی: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنی روشنی کو مکمل کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے، خواہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس دعوے کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ سارا عرب آپ کے قدموں کے نیچے آ گیا تھوڑے سے نہتے اور بے سروسامان لوگ ان پر غالب آ گئے، جو تعداد میں بہت زیادہ تھے، وقت جن کا ساتھ دے رہا تھا، جن کے پاس ہتھیار اور سازوسامان کا زبردست ذخیرہ موجود تھا۔

مادی اصطلاحات میں اس بات کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی کہ آپ کو عین اپنی پیشین گوئی کے مطابق عرب کے لوگوں اور ہمسایہ ملکوں پر کیسے اتنا زبردست غلبہ حاصل ہو گیا، اس کی صرف ایک ہی توجیہہ ممکن ہے، وہ یہ کہ آپ خدا کے نمائندے تھے، خدا نے اپنی مدد سے آپ کو آپ کے دشمن کے مقابلے میں غالب کیا اور آپ کے مشن کو اس حد تک کامیاب کیا کہ دشمن کے مقابلے میں نبی امی کا عین اپنے دعوے کے مطابق کامیاب ہونا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کائناتی طاقت کے نمائندے تھے، اگر آپ محض ایک انسان ہوتے تو کبھی یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کے الفاظ تاریخ بن جائیں، ایسی تاریخ جس کی مثال سارے انسانی واقعات میں کوئی ایک بھی نہیں، جے، ڈبلیو، ایچ، اسٹوبرٹ (J.W.H.stobart.) کے الفاظ میں

''آپ کے پاس جتنے کم ذرائع تھے، اور جو وسیع اور مستقل کارنامہ آپ نے انجام دیا، اس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری انسانی تاریخ میں اتنا نمایاں طور پر درخشاں نام اور کوئی نظر نہیں آتا جتنا نبی عربی کا ہے۔''

یہ آپ کے نمائندہ الٰہی ہونے کی ایسی حیرت انگیز دلیل ہے کہ سر ولیم میور (william muir.) جیسے شخص کو بھی بالواسطہ طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑا:۔

''محمد نے دشمنوں کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا، انھیں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ دن رات اپنی کامیابی کا انتظار رہتا تھا، بظاہر بالکل غیر محفوظ، بلکہ یوں کہئے کہ شیر کے منھ میں رہ کر وہ ہمت دکھائی کہ اس

کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہے تو صرف بائبل میں جہاں ایک نبی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر خدا سے کہا تھا کہ۔۔۔صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں۔''

(life of mahomed,p.228.)

۲۔قرآن کی دوسری پیشین گوئی جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ رومیوں کا ایرانیوں پر غلبہ ہے جو قرآن کی تیسویں سورہ (روم) میں وارد ہوئی ہے:۔

غلبت الروم فی ادنی الارض و ھم من بعد غلبھم سیغلبون''

جزیرہ نمائے عرب کے مشرق خلیج فارس کے دوسرے ساحل پر ایرانی حکومت قائم تھی اور مغرب میں بحر احمر کے کناروں سے لے کر اوپر بحر اسود تک سلطنت اور موخر الذکر کا بازنطینی سلطنت ہے، ان دونوں حکومتوں کی سرحدیں عرب کے شمال می عراق کے مشہور دریاؤں دجلہ وفرات پر آ کر ملتی تھیں یہ دونوں اپنے زمانے کی طاقت ور ترین سلطنتیں تھیں، رومی سلطنت کی تاریخ گبن کے بیان کے مطابق دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اور اس کو اپنے وقت کی مہذب ترین سلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

روم کے زوال پر جتنا لکھا گیا ہے، اتنا کسی تہذیب کیخاتمہ پر نہیں لکھا گیا اگر چہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہوسکتی جو دوسری تمام کتابوں سیآدمی کو مستغنی کر دے، تاہم مجموعی اعتبار سیاس عنوان پر سب سیزیادہ مفصل اور معتمد مواد اڈور ڈ گبن (edward gibbon.) کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے:۔

the history of decline and fall of the roman empire.

اس کتاب کی پانچویں جلد کے دوسرے باب میں قابل مصنف نے اس دور کے واقعات قلم بند کئے ہیں جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، روم کے ایک سابق بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں مسیحیت قبول کر کے اس کو سرکاری مذہب کی

حیثیت دے دی، چنانچہ روم کی بیشتر آبادی اب حضرت عیسیٰ کی پروکار تھی، اس کے مقابلے میں ایرانی سورج دیوتا کے پرستار تھے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے روم پر جس بادشاہ کی حکومت تھی اس کا نام ماریس (mauriec.) تھا۔ ماریس کی نا اہلی اور بد انتظامی کی وجہ سے آپ کو نبوت ملنے سے آٹھ سال قبل ۶۰۲ء میں اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کی قیادت ایک فوجی کپتان فوکاس (phocas.) نے کی تھی، بغاوت کامیاب ہوگئی اور فوکاس روم کے شہنشاہ کی جگہ تخت پر قابض ہوگیا۔۔۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شہنشاہ روم ماریس اور اس کے خاندان کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔

فوکاس نے اپنی ہمسایہ سلطنت ایران کو ایک سفیر بھیج کر نئی تخت نشینی کی اطلاع دی اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا لڑکا خسرو پرویز (chosroes 11) تھا، خسرو پرویز کو ۹۱۔۵۹۰ء میں اندرونی سازش اور بغاوت کی وجہ سے اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا تھا، اس زمانے میں مقتول رومی شہنشاہ ماریس نے اس کو اپنے علاقہ میں پناہ دی تھی، اور دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں دنوں قسطنطنیہ کے زمانہ ءقیام میں خسرو نے ماریس کی لڑکی سے شادی کر لی تھی، اور اس رشتہ کی بنا پر ماریس کو وہ اپنا باپ کہتا تھا، چنانچہ جب خسو کو رومی انقلاب کی خبر ملی تو وہ سخت برہم ہوا، اس نے رومی سفیر کو قید کرا دیا اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد فوراً اس نے اپنی فوجوں کے ذریعے روم پر چڑھائی کر دی ۲۰۳ء میں اس کی فوجیں دریائے فرات کو پار کر کے شام کے شہروں میں داخل ہوگئیں۔۔۔ فوکاس اپنی نا اہلی کی وجہ سے غیر متوقع حملہ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوا، ایرانی فوجیں بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ انطاکیہ کو فتح کرتے ہوئے یروشلم پر قابض ہوگئیں، ایرانی سلطنت کی حدود فرات سے پار کر کے یکا یک وادی ءنیل تک وسیع ہو گئے، سابقہ

رومی سلطنت کے مذہبی داروگیر کی وجہ سے چرچ کے مخالف فرقے نسطوری اور یعقوبی نیز یہودی پہلے سے رومی حکومت سے ناراض تھے، اب انھوں نے روم دشمنی میں نئے فاتحین کا ساتھ دیا، اس چیز نے خسرو کی کامیابی کو بہت آسان بنا دیا۔

فوکاس کی ناکامی دیکھ کر بعض اعیان سلطنت نے افریقی مقبوضہ کے رومی گورنر کے یہاں خاموش پیغام بھیجا کہ وہ ملک کو بچانے کی کوشش کرے، اس نے اپنے لڑکے ہرقل (heraclius.) کو اس مہم پر روانہ کیا، ہرقل سمندر کے راستے سے فوج لے کر افریقہ سے روانہ ہوا، اور یہ ساری کاروائی اس قدر رازداری کے ساتھ انجام پائی کہ فوکاس کو اس وقت تک اس کی خبر نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنے محل سے سمندر میں آتے ہوئے جہازوں کے نشانات نہیں دیکھ لئے، ہرقل معمولی لڑائی کے بعد دارالسلطنت پر قابض ہوگیا، اور فوکاس قتل کر دیا گیا۔

ہرقل نے فوکاس کو تو ختم کر دیا، مگر وہ ایرانی سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور ۲۱۶ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی اور جنوبی حصہ کھو چکے تھے، عراق، شام فلسطین، مصر، ایشیائے کوچک، ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا، رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، محاصرہ کی وجہ سے تمام راستے بند تھے، چنانچہ شہر میں قحط اور وبائی امراض نے پھیل کر مزید مصیبت پیدا کر دی، رومی سلطنت کے عظیم الشان درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا خود قسطنطنیہ کے اندر گھس آنے کا خوف تمام آبادی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ تمام کاروبار بند تھے، وہ پبلک مقامات جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب سنسان پڑے ہوئے تھے۔

آتش پرست حکومت نے رومی علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسیحیت کو مٹانے کیلئے شدید ترین مظالم شروع کئے، مذہب شعائر کی توہین شروع کی گئی، گرجا گھر مسمار کر دیئے گئے، تقریباً ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کر دیا گیا ہر جگہ آتش

کدے تعمیر کئے گئے، اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا مقدس صلیب کی اصل لکڑی جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر مسیح نے جان دے تھے، وہ چھین کر مدائن پہنچادی گئی۔

مورخ گبن کے الفاظ میں:۔

''اگر خسرو کے مقاصد واقعی نیک اور درست ہوتے تو وہ باغی فوکاس کے خاتمہ کے بعد رومیوں سے اپنے جھگڑے کو ختم کر دیتا اور افریقی فاتح کا اپنے بہترین ساتھی کی حیثیت سے استقبال کرتا جس نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کے محسن ماریس کا انتقام لے لیا تھا، مگر جنگ جاری رکھ کر اس نیا پنے اصل کردار کو نمایاں کر دیا۔'' ص ۴۷

اس وقت ایرانی شہنشاہیت اور رومی سلطنت میں کیا فرق پیدا ہو چکا تھا اور ایرانی فاتح اپنے کو کتنا بڑا سمجھنے لگا تھا، اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے، جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:۔

''سب خداؤں سے بڑا خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام، تو کہتا ہے کہ تجھے خدا پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچالیا۔''

ان حالات نے قیصر روم کو بالکل مایوس کر دیا، اور اس نے طے کرلیا کہ اب وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر بحری راستہ سے اپنے جنوبی افریقہ کی ساحلی قیام گاہ میں چلا جائے جو قرطاجنہ (carthage.) موجود تیونس میں واقع تھی، اب اس کے سامنے ملک کو بچانے کے بجائے اپنی ذات کو بچانے کا مسئلہ تھا۔ شاہی کشتیاں محل کے خزانوں سے لادی جا چکی تھیں، مگر عین وقت پر رومی کلیسا کے بڑے پادری نے اس کو مذہب کا واسطہ دے کر روکنے میں کامیابی حاصل کر لی، وہ اس کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ پر

لے گیا، اور اس کو آمادہ کیا کہ وہاں وہ اس بات کا عہد کرے کہ وہ اپنی اس رعایا کے ساتھ جیئے گا یا مرے گا جس کے ساتھ خدا نے اس کو وابستہ کیا ہے، (ص ۷۵) اسی دوران میں ایرانی جنرل سین (sain.) نے تجویز کیا کہ ہرقل ایک صلح کا قاصد شہنشاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے، اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، مگر جب شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے کہا:۔

''مجھ کو یہ نہیں، بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے، میں رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا، جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔'' (صفحہ ۷۶)

تاہم چھ سالہ لڑائی نے بالآخر ایرانی حکمران کو مائل کیا کہ وہ فی الحال کچھ شرائط پر صلح کر لے، اس نے شرط پیش کی۔

''ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار ریشمی تھان، ایک ہزار گھوڑے ایک ہزار کنواری لڑکیاں۔''

گبن ان شرائط کو بجا طور پر شرم ناک شرائط (ignominious terms.) کہتا ہے، ہرقل یقیناً ان شرائط کو قبول کر لیتا، مگر جتنی کم مدت میں اور جس چھوٹے سے لٹے ہوئے علاقے سے اس کو ان قیمتی شرائط کی تکمیل کرنی تھی، اس کے مقابلہ میں اس کے لئے زیادہ قابل ترجیح بات یہ تھی کہ وہ انھیں ذرائع کو دشمن کے خلاف آخری حملہ کی تیاری کے لئے استعمال کرے۔

ایک طرف یہ واقعات ہو رہے تھے، دوسری طرف ایران کے درمیان عرب کے مرکزی مقام ''مکہ'' میں ان واقعات نے ایک اور کشمکش پیدا کر دی تھی، ایرانی سورج دیوتا کو مانتے تھے، اور آگ کی پرستش کرتے تھے اور رومی وحی و رسالت کے ماننے والے تھے، اس لئے نفسیاتی طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومی

عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور مشرکین مظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مجوسیوں سے اپنا مذہبی رشتہ جوڑتے تھے، اس طرح روم و ایران کی کشمکش اس کشمکش کا ایک خارجی نشان بن گئی جو مکہ میں اہل اسلام اور کفار و مشرکین کے درمیان جاری تھی، دونوں گروہ سرحد پار کی اس جنگ کے انجام کو خود اپنی باہمی کشمکش کے انجام کی ایک علامت سمجھنے لگے، چنانچہ ۶۱۶ء میں جب ایرانیوں کا غلبہ نمایاں ہو گیا اور رومیوں کے تمام مشرقی علاقے ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے، اور اس کی خبریں مکہ پہونچیں تو اسلام کے مخالفین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ دیکھو ہمارے بھائی تمھارے مذہب رکھنے والوں پر غالب آ گئے ہیں، اسی طرح اپنے ملک میں بھی ہم تم کو اور تمھارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے، مکہ کے مسلمان جس بے حسی اور کمزوری کی حالت میں تھے، اس میں یہ الفاظ ان کے لئے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے، عین اسی حالت میں پیغمبر خدا کی زبان سے یہ الفاظ جاری کئے گئے۔

غلبت الروم فی ادلیٰ الارض و ھم من بعد علیھم سیغلبون فی بضع سنین، للہ الامرُ من قبل و من بعد ویومئذٍ یفرح المومنون بنصر اللہ ینصر من یشاءُ و ھو العزیز الرحیم وعد اللہ لا یخلفُ اللہ وعدہٗ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ (روم ۲۔ ۶)

ترجمہ:۔ رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر وہ غالب آ جائیں گے، پہلے اور پیچھے سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے، اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ غالب اور مہربان ہے خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

''اس وقت جب کہ یہ پیشین گوئی کی گئی'' گبن لکھتا ہے ''کوئی بھی پیشگی خبر اتنی

بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کا خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے"۔ (صفحہ ۱۴۷) مگر ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی ایک ایسی ذات کی طرف سے کی گئی تھی، جو تمام ذرائع وسائل پر تنہا قدرت رکھتا ہے، اور انسانوں کے دل جس کی مٹھی میں ہیں، چنانچہ ادھر خدا کے فرشتے نے ایک امی کی زبان سے یہ خبر سی اور ادھر ہرقل قیصر روم میں ایک انقلاب آنا شروع ہو گیا، گبن لکھتا ہے۔

"تاریخ کے نمایاں کرداروں میں سے ایک غیر معمولی کردار وہ ہے، جو ہرقل کے اندر ہم دیکھتے ہیں، اپنے لمبے دور حکومت کے ابتدائی اور آخری سالوں میں شہنشاہ سستی، عیاشی اور اوہام کا بندہ دکھائی دیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی مصیبتوں کا ایک بے حس اور نامرد تماشائی ہے، مگر صبح وشام کا بے رونق کہر دوپہر کے سورج سے کچھ دیر کے لئے چھٹ جاتا ہے، یہی حال ہرقل کا ہوا، اور محل کا آر کے ڈیس (arcadius.) یا یک میدان جنگ کا سیزر (caesar.) بن گیا، اور روم کی عزت چھ جرات مندانہ مہموں کے ذریعہ دوبارہ حاصل کر لی گئی، یہ رومی مورخین کا فرض تھا کہ وہ حقیقت سے پردہ اٹھاتے اور اس کی اس خواب اور بیداری کے وجوہ بیان کرتے، اتنے دنوں بعد اب ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی سیاسی اسباب نہیں تھے، بلکہ یہ زیادہ تر اس کے شخصی جذبے کا نتیجہ تھا، اسی کے تحت اس نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کر دیں، حتیٰ کہ اپنی بھانجی (martina.) کو بھی چھوڑ دیا جس سے اس کو اس قدر تعلق تھا کہ محرم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اس نے شادی کر لی"۔

(gibbon,vol.v.pp.76-77.)

وہی ہرقل جس کی ہمت پست ہو چکی تھی، اور جس کا دماغ اس سے پہلے کچھ کام نہیں کرتا تھا، اب اس نے نہایت کامیاب منصوبہ بنایا، قسطنطنیہ میں بڑے عزم و

انہماک کے ساتھ جنگی تیاریاں شروع ہوگئیں، تاہم اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ ۶۲۶ء میں جب ہرقل اپنی فوجیں لے کر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومن امپائر کا آخری لشکر دیکھ رہی ہے۔

ہرقل جانتا تھا کہ ایرانی حکومت سمندری طاقت میں کمزور ہے، اس نے اپنے سمندری بیڑے کو پشت سے حملہ کے لئے استعمال کیا، اس نے اپنی فوجیں بحر اسود کے راستے سے گزار کر آرمینیا میں اتار دیں اور وہاں عین اس مقام پر ایرانیوں کے اوپر ایک بھرپور حملہ کیا، جہاں سکندر اعظم نے اس وقت کی ایرانی سلطنت کو شکست دی تھی جب اس نے شام سے مصر تک اپنا مشہور مارچ کیا تھا، ایرانی اس غیر متوقع حملہ سے گھبرا گئے اور ان کے قدم اکھڑ گئے، مگر ابھی وہ ایشیائے کوچک میں زبردست فوج رکھتے تھے، وہ دوبارہ اس فوج سے حملہ کرتے اگر ہرقل نے اس کے بعد شمال کی جانب سمندر سے اسی قسم کی دوسری غیر متوقع چڑھائی نہ کی ہوتی، پھر وہ سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ واپس آیا، آواریوں () سے ایک معاہدہ کیا اور ان کی مدد سے ایرانیوں کو ان کے دارالسلطنت کے گرد روک دیا، ان دو حملوں کے بعد اس نے مزید تین مہمیں جاری کیں۔ ۶۲۳ء میں ۶۲۴ء میں یہ مہمیں بحر اسود کے جنوبی ساحل سے حملہ آور ہو کر ایرانی قلمرو میں گھسیں اور میسوپوٹامیا تک پہنچ گئیں، اس کے بعد ایرانی ضارحیت کا زور توٹ گیا، اور تمام رومی علاقے ایرانی فوجوں سے خالی ہو گئے، اب ہرقل خود ایرانی شہنشاہیت کے قلب پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں تھا، تاہم آخری فیصلہ کن جنگ دجلہ کے کنارے نینوا کے مقام پر دسمبر ۶۲۷ء میں ہوئی۔

اب خسرو کی ہمت چھوٹ گئی تھی، وہ اپنے محبوب محل ''دست گرد'' سے بھاگنے کی تیاریکرنے لگا، مگر اسی دوران میں خود اس کے محل کے اندر اس کے خلاف بغاوت ہو گئی، اس کے لڑکے شیرویہ نے اس کو گرفتار کر کے ایک تہہ خانے میں بند کر دیا جہاں وہ پانچویں دن بے کسی کی حالت میں مر گیا، اس کے اٹھارہ لڑکوں کو اس کی آنکھ کے

سامنے قتل کر دیا گیا، مگر اس کا یہ لڑکا بھی آٹھ مہینے تخت پر رہ سکا، اس کے بعد دوسرے شہزادے نے اس کو قتل کر کے تاج پر قبضہ کر لیا، اس طرح شاہی خاندان کیا ندر آپس میں تلواریں چلنا شروع ہو گئیں، یہاں تک کہ چار سال میں نو بادشاہ بدلے گئے، ان حالات میں ظاہر ہے کہ از سر نو رومیوں کا مقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا، خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر صلح کر لی، مقدس صلیب کی اصل لکڑی واپس کر دی گئی، اور مارچ ۶۲۸ء میں فاتح ہرقل اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے، اور بے شمار لوگ دارالسلطنت کیا ہر لیمپوں اور زیتون کی شاخوں کو لئے ہوئے اپنے ہیرو کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ (صفحہ ۹۴)

اس طرح قرآن نے رومیوں کے دوبارہ غلبہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک اپنے وقت (دس سال کے اندر) مکمل طور پر پوری ہو گئی۔

گبن نے اس پیشین گوئی پر حیرت کا اظہار کیا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کی اہمیت گھٹانے کے لئے اس نے بالکل غلط طور پر اس کو خسرو کے نام آپ کے دعوت نامے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

''ایرانی شہنشاہ نے اپنی فتح مکمل کر لی تو اس کو مکہ کے ایک گم نام شہری کا خط ملا جس میں اس کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ محمد کو پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرے، اس نے دعوت کو نامنظور کر دیا اور خط کو چاک کر دیا، رسول عربی کو جب خبر ملی تو انھوں نے کہا ''خدا اسی طرح خسرو کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور اس کی طاقت کو برباد کر دے گا۔''

مشرق کے دو عظیم سلطنتوں کے عین کنارے بیٹھے ہوئے محمد ان دنوں حکومتوں کی باہمی تباہی سے اندر ہی اندر خوش ہوتے رہے اور ایرانی فتوحات کے عین وسط میں انھوں نے یہ پیشین گوئی کرنے کی جرات

کی کہ چند سال کے بعد فتح دوبارہ رومیوں کے جھنڈے کی طرف لوٹ آئے گی، اس وقت جب یہ پیشین گوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔''

(gibbon,vol.v.pp.73-74.)

مگر اسلامی تاریخ کا ہر مورخ جانتا ہے کہ اس پیشین گوئی کا خسرو کے نام دعوت نامے سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ شہنشاہ ایران کے نام اسلام کا دعوت نامہ ہجرت کے ساتویں سال صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا ہے، جو سن عیسوی کے لحاظ سے ۶۲۸ء ہوتا ہے، جب کہ پیشین گوئی ہجرت سے پہلے مکہ میں ۶۱۶ء میں نازل ہوئی تھی۔

۳۔قرآن کی تیسری خصوصیت کو جس میں اس کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن باوجود یہ کہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا، اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہوسکی، اگر یہ صرف ایک انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ممکن تھا۔

چین کے نوجوان طلبہ کی ایک جماعت جو حکومت کے زیر اہتمام کیلی فورینا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، ان میں سے تقریباً بارہ افراد نے برکلے کے گرجا گھر میں جا کر پادری سے کہا کہ وہ ان کے لئے اتوار کے ایک کلاس کا انتظام کرے، چینی نوجوانوں نے نہایت صفائی سے کہا کہ انھیں ذاتی طور پر عیسائیت سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، اور نہ وہ خود عیسائی بننا چاہتے، البتہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مذہب نے امریکی تمدن پر کیا اور کتنے اثرات ڈالے ہیں، پادری نے اس جماعت کی ہفتہ وار تعلیم کے لئے ریاضیات اور فلکیات کے ایک عالم (peter m.stoner.) کو مقرر کیا، اس واقعہ کے چار مہینے بعد تمام نوجوانوں نے عیسائیت قبول کرلی، اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ کیا تھی، اس کو معلم کی زبان سے سنئے:۔

''میرے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کے سامنے مذہب کی کون سی بات رکھی جائے، کیونکہ یہ نوجوان بائبل پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے، بائبل کی محض رواجی تعلیم بے فائدہ معلوم ہوتی تھی، اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میں نے اپنی تعلیم کے زمانے میں بائیبل کے پہلے باب (کتاب پیدائش) اور سائنس میں بہت قریبی مناسبت پائی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کے سامنے یہی بات پیش کروں۔

میں اور طلبی قدرتی طور پر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کائنات کی پیدائش کے متعلق مواد زمین و آسمان کے بارے میں سائنس کی موجودہ معلومات حاصل ہونے سے ہزاروں سال پہلے لکھا گیا ہے، ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ موسیٰؑ کے زمانے میں کائنات کے متعلق لوگوں کے جو خیالات تھے، اس کو موجودہ زمانے کی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نہایت لغو معلوم ہوں گی۔

ہم نے پورا موسم سرما کتاب پیدائش کے پہلے باب میں گزار دیا، طلبہ کام لے کر یونیورسٹی کی لائبریری میں چلے جاتے اور بڑی محنت کے ساتھ جوابات تیار کر کے لاتے، موسم سرما کے خاتمہ پر پادری نے مجھے بتایا کہ طلبہ کی پوری جماعت اس کے پاس یہ کہنے کے لئے آئی تھی کہ وہ عیسائی بننا چاہتے ہیں، انھوں نے اقرار کیا کہ ان کے اوپر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بائبل خدا کی الہامی کتاب ہے۔'' (the evidence of god,p.p.137-38.)

مثال کے طور پر زمین کی ابتدا کے بارے میں کتاب پیدائش کا فقرہ:۔

''گہرائیوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔''

یہ موجودہ معلومات کے مطابق اس وقت کی بہترین تصویر ہے، جب زمین ابھی گرم تھی، اور اس کی گرمی کی وجہ سے پانی بخارات بن کر اڑ گیا تھا، اس وقت ہمارے تمام سمندر کثیف بادلوں کی شکل میں فضا میں معلق تھے، اور اس کی وجہ سے روشنی زمین کی سطح تک نہیں پہونچ پاتی تھی۔

ہمارا ایمان ہے کہ انجیل اور تورات اصلاً اسی طرح خدا کی کتابیں ہیں جیسے قرآن خدا کی کتاب ہے اس لئے ان میں علم الٰہی کے شرارے بلاشبہ موجود ہیں مگر ان کتابوں کے اصل الفاظ محفوظ نہیں رہے ہزاروں برس گزرنے کے بعد بائبل اب ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب کی شکل میں ہے جس میں کہ کریسی مارلس کے الفاظ میں ترجمہ ( ) اور انسانی الحاق ( ) کی وجہ سے اصل خدائی نسخہ کے مقابلے میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے، اس طرح یہ صفحے پوری حیثیت میں اصل شکل کو کھو چکے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو منسوخ کر کے ہمارے لئے اپنی کتاب کا تصحیح شدہ اڈیشن (قرآن) نازل کیا قرآن اپنی صحت اور جامعیت کی وجہ سے بدرجہ اتم ان ان خصوصیات کا حامل ہے جن کی صرف ایک جھلک اب تک کتب قدیمہ میں باقی رہ گئی ہے۔

یہاں میں قرآن کی اسی خصوصیت کو اس کی صداقت کی تیسری دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں قرآن باوجود یہ کہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ قرآن ایک ایسے زمانے میں اترا جب انسان عالم فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، اس وقت بارش کے متعلق یہ تصور تھا کہ آسمان میں کوئی دریا ہے جس سے پانی بہہ کر زمین پر گرتا ہے، اور اسی کا نام بارش ہے، زمین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ چپٹی فرش کے مانند ہے، اور آسمان اس کی چھت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر کھڑی کی گئی ہے ستاروں کے متعلق یہ خیال تھا کی وہ چاندی کی چمکتی ہوئی

کیلیں ہیں جو آسمان کے گنبد میں جڑی ہوئی ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے چراغ ہیں جو رات کے وقت رسیوں کی مدد سے لٹکائے جاتے ہیں، قدیم اہل ہند یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک گائے کے سینگ پر ہے اور جب گائے زمین کو ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے تو اس کی سر کی جنبش سے زلزلہ آ جاتا ہے، کوپر نیکس (۱۵۴۳ء-۱۴۷۳ء) تک یہ نظریہ تھا کہ سورج ساکن ہے، اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

اس کے بعد علم کی ترقی ہوئی انسان کے مشاہدے اور تجربے کی قوت بڑھ گئی جس کی وجہ سے نئی نئی معلومات حاصل ہوئی، زندگی کا کوئی شعبہ اور علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں پہلے کے مسلمات بعد کی تحقیق سے غلط ثابت نہ ہو گئے ہوں۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا کوئی بھی انسانی کلام ایسا نہیں ہو سکتا جو آج بھی اپنی صحت کو پوری طرح باقی رکھے ہوئے ہو۔۔۔ کیونکہ آدمی اپنے وقت کی معلومات کی روشنی میں بولتا ہے وہ شعور کے تحت بولے یا لاشعور کے تحت، بحر حال وہ وہی کچھ دہرائے گا جو کچھ اس نے اپنے زمانے میں پایا ہو، چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی کوئی بھی انسانی کتاب آج ایسی موجود نہیں ہے، غلطیوں سے پاک ہو۔۔۔ مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے وہ جس طرح ڈیڑھ ہزار برس کے دور میں برحق تھا آج بھی وہ اسی طرح برحق ہے، زمانے کے گزرنے سیاس کیصداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ واقعہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جس کی نگاہ ازل سے ابد تک محیط ہے۔۔۔ جو سارے حقائق کو اپنی اصل شکل میں جانتا ہے جس کی واقفیت زمانے اور حالات کی پابند نہیں اگر یہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام ہوتا تو بعد کا زمانہ اسی طرح اس کو غلط ثابت کر دیتا، جیسے ہر انسانی کلام بعد کے زمانے میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔

قرآن کا اصل موضوع اُخروی سعادت ہے، اس لحاظ سے وہ دنیا کی معروف

علوم وفنون می سے کسی کی تعریف میں نہی آتا، مگر اس کا مخاطب چونکہ انسان ہے، اسی لئے قدرتی طور پر وہ اپنی تقریروں میں ہر اس علم کو مس کر رہا ہیتو خواہ وہ اس پر کوئی تفصیلی کلام نہ کرے، اگر اس کی معلومات ناقص ہیں، تو یقینی طور پر وہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اس صورت واقعہ سے ٹھیک ٹھیک مطابقت نہ رکھتے ہوں، مثلاً ارسطو نے عورت کی کم تری ثابت کرنے کے لئے یہ کہا۔۔۔'[اس کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ یہ فقرہ علم الاجسام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، مگر اس کے باوجود ایک فقرہ ہے جو علم الاجسام سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مرد اور عورت کے منھ میں دانت کی تعداد یکساں ہوتی ہے مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن اگر چہ علوم انسانی کو کہیں نہ کہیں مس کرتا ہے، مگر اس کے بیانات میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں آنے پائی جو بعد کی وسیع تر تحقیقات سے یہ ثابت کرے کہ یہ شخص کا کلام ہے، جس نے کم تر روشنی میں یہ باتیں کہیں تھیں! صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بالاتر ہستی کا کلام ہے، جو اس وقت بھی جانتا تھا، جب کوئی نہیں جانتا تھا اور ان چیزوں کو بھی جانتا تھا جس سے اب تک لوگ ناواقف ہیں۔

یہاں میں مختلف علوم سے متعلق چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک علم کو مس کرتے ہوئے بھی قرآن کس طرح حیرت انگیز طور پر ان صداقتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، جو قرآن کے نزول کے وقت معلوم شدہ نہیں تھا، بلکہ بعد کو دریافت ہوئیں۔

اس بحث سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جدید تحقیقات سے قرآنی الفاظ کی مطابقت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ی تحقیقات متعلقہ واقعہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو چکی ہیں، اور اس طرح مادی کائنات کے بارے میں قرآن کے اشاراتی الفاظ کی تفسیر کے لئے ہم کو ضروری مواد حاصب ہو گیا ہے، اب اگر

مستقبل کا مطالعہ کسی موجودہ تحقیق کا کلاً یا جزءاً غلط ثابت کر دے تو اس سے کسی بھی درجہ میں قرآن کی تغلط نہیں ہوگی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ قرآن کی مجمل اشارہ کے تفصیلی تعین میں غلطی ہوگئی تھی، ہم کو یقین ہے کہ آئندہ کی صحیح تر معلومات قرآن کے اشاراتی الفاظ کو زیادہ صحیح طور پر واضح کرنے والی ہوں گی، وہ کسی اعتبار سے اس سے مختلف نہیں ہو سکتیں۔

اس سلسلے میں قرآن کے جو بیانات ہیں، ان کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو ان امور سے متعلق ہیں، جن کے متعلق انسان کو نزول قرآن کے وقت کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں تھیں، اور دوسرے وہ جن کے متعلق وہ سطحی اور ظاہری معلومات رکھتا تھا۔

کائنات کی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق دور سابق کے لوگ کچھ نہ کچھ جانتے تھے۔ مگر ان کا یہ علم ان دریافتوں کے مقابلے میں بے حد ناقص تھا اور ادھورا تھا، جو بعد کو علمی ترقی کے دور میں انسان کے سامنے آئیں۔ قرآن کی مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی سائنسی کتاب نہیں تھی، اس لئے اگر وہ عالم فطرت کے بارے میں نئے نئے انکشافات لوگوں کے سامنے رکھنا شروع کر دیتا تو انھیں چیزوں پر بحث چھڑ جاتی اور اس کا اصل مقصد۔ ذہن کی اصلاح۔ پس پشت چلا جاتا، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے علمی ترقی سے بہت پہلے کے زمانے میں اس طرح کی چیزوں پر کلام کیا، اور ان کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کئے جس میں دور سابق کے لوگوں کے لئے تو حش کا کوئی سامان نہیں تھا، اور اسی کے ساتھ بعد کے انکشافات کا بھی وہ پوری طرح احاطہ کئے ہوئے تھے۔

الف: قرآن میں دو مقامات پر پانی کا ایک خاص قانون بیان کیا گیا ہے، اول سورہ فرقان میں، دوسرے سورہ رحمان میں:۔

اول الذکر اقتباس حسب ذیل ہے:۔

وھوالذی مرج البحرین ھذا عذب فرات و ھذاملح اجاج و جعل بنیھما برزخا و حجرا محجورا (الفرقان ۵۳)

ترجمہ:۔اور وہی ہے جس نے ملائے دو دریا ایک کا پانی میٹھا خوش گوار ہے اور ایک کا کھاری تلخ ، اور دونوں کے درمیان ایک آڑ رکھ دی۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان (الرحمن ۱۹۔۲۰)

ترجمہ:۔اس نے چلائیدو دریا ملتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرسکتے۔

ان آیات میں جس مظہر فطرت کا ذکر ہے وہ قدیم ترین زمانے کو معلوم تھا، وہ یہ کہ دو دریاؤں کے پانی جب باہم مل کر بہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے میں شامل نہیں ہوجاتے مثال کے طور پر چاٹگام (مشرقی پاکستان) سے لے کر ارکان (برما) تک دو دریا مل کر بہتے ہیں اور اس پورے سفر میں دونوں کا پانی بالکل الگ الگ نظر آتا ہے، دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے، ایک طرف کا پانی میٹھا اور ایک طرف کا کھاری اسی طرح سمندر کے ساحلی مقامات پر جو دریا بہتے ہیں، ان میں سمندر کے اثر سیر ابر مدو جزر (جوار بھاٹا) آتا رہتا ہے مدکیوقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہتزور سےچڑھجاتا ہے، لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مخلط نہیں ہوتے اوپر کھاری رہتا ہےاور نیچے میٹھا، اس کے بعد جب جزر رہوتا ہے تو اوپر سے کھاری پانی اتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں رہتا ہے آلہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے مقام پر میں نے خود دیکھا کہ دونوں دریا ملنے کے باوجود الگ الگ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور درمیان میں ایک لکیر سی مسلسل

چلی گئی ہے۔

یہ بات قدیم زمانے میں انسان کے مشاہدے میں آ چکی ہے، مگر یہ واقعہ کس قانون فطرت کے تحت واقع ہوتا ہے، یہ ابھی حال میں دریافت کیا گیا، جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رقیق اشیاء میں سطح تناؤ (surface tension.) کا ایک خاص قانون ہے، اور یہی دونوں قسم کے پانی کو الگ الگ رکھتا ہے۔۔ چونکہ دونوں سیالوں کا تناؤ (tension.) مختلف ہوتا ہے، اس لئے وہ دونوں کو اپنی اپنی حد میں روکے رہتا ہے، آج کل اس قانون کو سمجھ کر جدید دنیا نے بے شمار فوائد حاصل کئے ہیں، قرآن نے ''بینھما برزخ لا یبغیان'' کے الفاظ بول کر اس واقعہ کی ایسی تعبیر کی جو قدیم مشاہدے کے اعتبار سے ٹکرانے والی نہیں تھی، اور اب جدید دریافت پر بھی وہ پوری طرح حاوی ہے، کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برزخ (آڑ) سے مراد وہ سطح کا تناؤ (surface tension.) ہے جو دونوں قسم کے پانی کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جو دونوں کو مل جانے سے روکے ہوئے ہے۔

سطحی تناؤ کے قانون کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھئے، اگر آپ گلاس میں پانی بھریں تو وہ کنارے تک پہنچ کر فوراً بہنے لگے گا، بلکہ ایک سوت کے بقدر اٹھ کر کناروں کے اوپر گولائی میں ٹھہر جائے گا، یہی وہ چیز ہے جس کو شاعر نے ''خط پیمانہ'' کہا ہے۔

اندازۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ
ساغر سے اٹھیں موجیں بن کر خط پیمانہ

گلاس کے کناروں کے اوپر پانی کی جو مقدار ہوتی ہے، وہ کیسے ٹھہرتی ہے بات یہ ہے کہ رقیق اشیا کی سطح کے سالمات (molecules.) کے بعد چونکہ کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے ان کا رخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے، اس طرح کے سالمات کے درمیان کشش اتصال بڑھ جاتی ہے، اور قانون اتصال (cohesion.) کے

عمل کی وجہ سے پانی کی سطح کے اوپر ایک قسم کی لچک دار جھلی (elastic film.) سی بن جاتی ہے، اور پانی گویا اس کے غلاف میں اس طرح ملفوف ہو جاتا ہے جیسے پلاسٹک کی سفید جھلی میں لپیا ہوا نمک ملفوف ہوتا ہے، سطح کا یہی پردہ اوپر ابھرے ہوئے پانی کو روکتا ہے، یہ پردہ اس حد تک قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کے اوپر سوئی ڈال دی جائے تو وہ ڈوبے گی نہیں بلکہ پانی کی سطح پر تیرتی رہے گی، اسی کو سطحی تناؤ کہا جاتا ہے، اور یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر تیل اور پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے اور یہی وہ ''آڑ'' ہے جس کی وجہ سے کھاری پانی اور میٹھے پانی کے دو دریا مل کر بہتے ہیں مگر ایک کا پانی دوسرے میں شامل نہیں ہوتا۔

ب:۔ ارشاد ہوا ہے۔

الله الذی رفع السموات بغیم عمدترونها۔ (رعد۔ ۲)

اللہ وہ ہے جس نے آسمان کو بلند کیا، بغیر ایسے ستونوں کے جنھیں تم دیکھ سکو۔

دور قدیم کے انسان کے لئے یہ الفاظ اس کے ظاہری مشاہدے کے عین مطابق تھے، کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے سر کے اوپر سورج، چاند اور ستاروں کی ایک دنیا کھڑی ہے، مگر کہیں اس کا پایہ اور کھمبا نظر نہیں آتا اور اب جدید ترین معلومات رکھنے والے انسان کے لئے بھی اس میں مکمل معنویت موجود ہے کیونکہ جدید ترین مشاہدہ بتاتا ہے کہ اجرام سماوی ایک لامحدود خلا میں بغیر کسی سہارے کے قائم ہیں، اور ایک ''عمدہ مرئی''، یعنی کشش ثقل (gravitational pull.) ان کو بالائی فضا میں سنبھالے ہوئے ہے.

ج:۔ اسی طرح سورج اور تمام ستاروں کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

کل فی فلك یسبحون، (الانبیاء۔ ۳۳)

سب کے سب ایک آسمان میں تیر رہے ہیں۔

دور قدیم میں بھی انسان اجرام سماوی کو حرکت کرتا ہوا دیکھتا تھا، اس لئے ان

الفاظ سے اسکو توحش نہیں ہوا، مگر جدید معلومات نے ان الفاظ کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے، بسیط اور لطیف خلا میں اجرام سماوی کی گردش کے لئے تیرنے سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی؛

د:۔رات اور دن کے متعلق قرآن میں ہے:۔

يغشى اليل النهار يطلبه حثيثاً۔

اللہ اوڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔

یہ الفاظ قدیم انسان کے لئے صرف رات دن کی ظاہری آمدوشد کو بتاتے تھے مگر اس میں نہایت عمدہ اشارہ زمین کی محوری گردش کی طرف بھی موجود ہے، جو جدید مشاہدے کے مطابق رات اور دن کی تبدیلی کی اصل وجہ ہے، یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ روس کے پہلے خلائی مسافر نے خلا سے واپسی کے بعد اپنے جو مشاہدات بیان کئے تھے، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ زمین کو اس نے اس شکل میں دیکھا کہ سورج کے سامنے محوری گردش کی وجہ سے اس کے اوپر اندھیرے اور اجالے کی آمدورفت کا ایک تیز تسلسل (rapid succession.) جاری تھا اس طرح کے بیانات قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری مثالیں وہ ہیں جن کے متعلق زمانے کے لوگ قطعاً کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے، قرآن نے ان کا ذکر کیا، اور ایسی باتیں کہیں جو حیرت انگیز طور پر جدید انکشافات سے صحیح ثابت ہوتی ہیں، یہاں میں مختلف علمی شعبوں سے اس کی چند مثالیں پیش کروں گا۔

فلکیات:

قرآن نے مادی کائنات کے آغاز و انجام کا ایک خاص تصور دیا، یہ تصور سو برس پہلے تک انسان کے لئے بالکل نامعلوم تھا اور نزول قرآن کے زمانے میں تو اس کا تصور بھی کسی ذہن میں نہیں گزر سکتا تھا مگر جدید مطالعہ نے حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کی ہے، آغاز کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان یہ ہے۔

اولم یر الذین کفروا ان السموات الارض کانتا رتقا ففتقنا ھما۔ (انبیاء۔ ۳۰)

کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ زمین و آسمان ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو پھاڑ دیا۔

اور اس کا انجام یہ بتایا گیا ہے:۔

یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب۔

اس دن لپیٹ دیں گے ہم آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں طومار میں کاغذ۔

ان الفاظ کے مطابق کائنات ابتداءً ایک سمٹی ہوئی حالت میں تھی، اور اس کے بعد پھیلنا شروع ہوئی، اس پھیلاؤ کے باوجود اس کا اصل مادہ اتنا کم ہے کہ تھوڑی سی جگہ میں اس کو دوبارہ سمیٹا جا سکتا ہے۔

کائنات کے بارے میں جدید ترین تصور یہی ہے، مختلف قرائن اور مشاہدات کی بنیاد پر سائنس داں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ابتدا میں کائنات کا مادہ جمود اور سکون کی حالت میں تھا، یہ ایک بہت ہی سخت سکڑی ہوئی گھٹی ہوئی انتہائی گرم گیس تھی، تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک زبردست دھماکے سے وہ پھٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹوٹے ہوئے اجزاء چاروں طرف پھیلنے لگے، جب ایک بار پھیلاؤ شروع ہو گیا تو اس کا جاری رہنا لازمی تھا، کیونکہ اجزائے مادہ جیسے جیسے دور ہوں گے، ان کا باہمی کشش کا اثر ایک دوسرے پر کم ہوتا جائے گا، آغاز میں کائنات

کا جو مادہ تھا، اس کے مکانی دائرہ کا اندازہ تقریباً ایک ہزار ملین سال نور ہے اور اب پروفیسر ایڈنگٹن کے اندازے کے مطابق وہ سابقہ دائرہ کے مقابلے میں تقریباً دس گنا بڑھ چکا ہے، یہ عمل توسیع اب بھی جاری ہے، ایڈیشن کے الفاظ میں:۔

''ستاروں اور کہکشاؤں کی ایک ایسے ربر کے غبارے کی سطح کے نشانات کی سی ہے جو مسلسل پھیل رہا ہو، اسی طرح اپنی ذاتی حرکت کیساتھ تمام آسمانی کرے کائناتی پھیلاؤ کے ساتھ ہر آن دور ہوتے جا رہے ہیں۔''

(the limiation of science,p.20)

دوسری بات بھی جدید ترین مطالعہ سے کائنات کے ڈھانچے کے عین مطابق ثابت ہوئی ہے، قدیم انسان یہ سمجھتا تھا کہ ستارے اتنے فاصلوں پر ہیں جیسے کہ وہ بظاہر نظر آتے ہیں، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ دوری کی وجہ سے قریب قریب نظر آتے ہیں، ورنہ وہ ایک دوسرے سے بے انتہا بعید فاصلے پر واقع اور یہی نہیں بلکہ وہ اجسام جو بظاہر سالم نظر آتے ہیں، ان کا بھی ایک بڑا حصہ درحقیقت خلا ہے جس طرح شمسی نظام میں بہت سے سیارے اور سیارچے ایک دوسرے سے دور دور فاصلوں پر رہتے ہوئے ایک نظام کے تحت گردش کرتے ہیں، اسی طرح ہر مادی جسم چھوٹے پیمانے کے بے شمار شمسی نظاموں کا مجموعہ ہے جن کو ''ایٹم'' کہتے ہیں۔ نظام شمسی کا خلا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، مگر ایٹمی نظام کا خلاء انتہاء چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا، گویا ہر چیز خواہ وہ بظاہر ٹھوس نظر آ رہی ہو، اندر سے کھوکھلی ہے مثلاً چھ فٹ لمبے چوڑے انسانی جسم کے مادی ذرات کے درمیان سے اگر خلا یا مکان کو نکال دیا جائے تو باقی ماندہ مادہ کی بساط بس ایک غیر مرئی دھبہ کی سی رہ جائے گی۔ اسی طرح فلکی طبیعیات کے ماہرین (astrophysicists.) نے کائنات میں پھیلے ہوئے پورے مادہ کا حساب لگایا ہے، ان کا کہنا ہے۔

if all this were srueezed without leaving any space,the size of the universe will be only thirty times the size of the sun.

یعنی اگر ساری کائنات کو اس طرح سمیٹ دیا جائے کہ اس میں خلا باقی نہ رہے تو ساری کائنات کا حجم موجودہ سورج سے صرف ۳۰ گنا زیادہ ہوگا جب کہ کائنات کی وسعت کا یہ حال ہے کہ شمسی نظام سے بعید ترین کہکشاں جو اب تک دیکھی جا سکتی ہے، وہ سورج سے کئی ملین سال نور کے فاصلے پر واقع ہے۔

۲۔ دور جدید کے ماہرین فلکیات اپنے مشاہدیاور ریاضیاتی اندازے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اجرام سماوی جس قانون کے تحت گردش کر رہے ہیں، اس کے مطابق مستقبل بعید میں ایک وقت آنیوالا ہے، جب چاند زمین کے بہت قریب آ جائے گا، اور دوطرفہ کشش کی تاب نہ لاکر پھٹ جائے گا اور اس کے ٹکڑے زمین کے گرد فضا میں پھیل جائیں گے۔

(man does not stand alone,p.24.)

''شق قمر'' کا یہ واقعہ اسی قانون کشش کے تحت ہوگا، جس کا مظاہرہ جوار ابھاٹے کی شکل میں سمندروں میں ہوتا رہتا ہے، چاند بالائی فضا میں ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے یعنی زمین سے اس کا فاصلہ صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے، اس قربت کی وجہ سے اس کی کشش کا اثر سمندروں پر پڑتا ہے، اور دن میں دوبار پانی اوپر اٹھ کر غیر معمولی تموج پیدا کرتا ہے، یہ موجیں بعض مقامات پر ساٹھ فٹ کے قریب اوپر تک اٹھ جاتی ہیں، اور خشکی کی سطح بھی اس قمری کشش سے چند انچ تک متاثر ہوتی ہے، چاند اور زمین کا موجودہ فاصلہ بہت مناسب مقدار پر ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں، اس کی بجائے اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً پچاس ہزار میل پر آ جائے تو سمندروں میں اس شدت سے طوفان برپا ہو کہ خشکی کا بیشتر حصہ اس میں غرق ہو جائے اور طوفانی موجوں کے مسلسل ٹکراؤ سے پہاڑ کٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں، اور زمین اس کی کشش سے پھٹنے لگے۔

ماہر فلکیات کا اندازہ ہے کہ زمین کے ابتدائی پیدائش کے وقت چاند اسی طرح زمین کے قریب تھا، اور اسوقت زمین کی سطح پر یہ سب کچھ ہو چکا ہے، اس کے بعد

فلکیاتی قانون نے اسے موجودہ دوری پر پہنچا دیا، ان کا خیال ہے کہ ایک بلین سال تک یہ صورت حال باقی رہے گی اور اس کے بعد یہی فلکی قانون دوبارہ چاند کو زمین کے قریب لائے گا، اور اس وقت چاند اور زمین کی باہمی کشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ چاند پھٹ جائے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے گرد ایک حلقہ کی شکل میں پھیل جائے گا۔

یہ نظریہ حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے، جو سورۂ قمر میں وارد ہے، یعنی قیامت جب قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اور اس کا پھٹنا قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہو گا۔

اقتربت الساعة وانشق القمر وان یروا ایةً یعرضو او یقولوا سحر مستمر (القمر۔ ۱، ۲)

یعنی قیامت نزدیک آ گئی اور چاند پھٹ گیا اور یہ لوگ کوئی نشان دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو سدا سے چلا آ رہا ہے۔

ارضیات:۔

پہاڑوں کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ وہ زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ہیں مثلاً فرمایا:

والقی فی الارض روسی ان تمید یکم۔

اور زمین میں پہاڑ بنا دیئے تا کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔

(لقمان 10)

ان الفاظ کے نزول کے پورے تیرہ سو برس تک انسانی علم پہاڑوں کی اس حیثیت کے بارے میں بالکل بے خبر تھا مگر اب جغرافیہ اس سے آشنا ہو چکا ہے، اور جدید جغرافیائی اصطلاح میں اس توازن کو (isostasy.) کہا جاتا ہے اگر چہ اس

سلسلے میں انسان کا علم ابھی ابتدائی منزل میں ہے، تاہم انگلن کے الفاظ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ امین کی سطح پر جو ہلکا مادہ تھا، وہ پہاڑوں کی شکل میں ابھر آیا اور جو بھاری مادہ تھا، وہ گہری خندقوں کی صورت میں دب گیا جن میں اب سمندر کا پانی بھرا ہوا ہے، اس طرح ابھار اور دباؤ نے مل کر زمین کا توازن برقرار کر رکھا ہے۔"

ایک اور مصنف لکھتا ہے۔

"جیسے خشکی پر وادیاں ہیں، اسی طرح سمندر کے نیچے بھی وادیاں ہیں مگر سمندر کی تہہ کی اکثر وادیاں زیادہ گہری اور انسان کے تجرباتی دائرہ کے لحاظ سے بہت دور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی دباؤ سے سمندروں میں گہرے غار ہو گئے ہیں (یہ وادیاں سطح سمندر سے ۳۵ ہزار فٹ تک گہری ہیں، یہ گہرائی کسی بھی پہاڑ کی بلندی سے زیادہ ہے، بعض مقامات پر یہ گھاٹیاں اتنی گہری ہیں کہ اگر زمینی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ماونٹ ایورسٹ کو جو ۲۹۰۰۲ فٹ بلند ہے، وہاں ڈال دیا جائے تو اس کے اوپر ایک میل کی اونچائی تک پانی بہتا رہے گا) حیرت یہ ہے کہ سمندری خندقیں (oceanic trenches.) دور سمندر کے درمیان واقع ہونے کے بجائے خشکی کے قریب قریب پائی جاتی ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا عظیم دباؤ تھا، جس نے سمندر کی تہہ میں یہ زبردست غار پیدا کر دیئے، مگر جزائری سلسلوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے ان کی قربت ظاہر کرتی ہے کہ پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندری خندقوں میں کوئی باہمی تعلق ہونا چاہیے، گویا کہ زمین اونچائی اور گہرائی کے ذریعہ اپنے توازن (balance.) کو قائم رکھتی ہے، جغرافیہ کے بعض مستند علماء کا خیال ہے کہ سمندری گہرائیاں آئندہ ابھرنے والی خشکی اور سمندر کی تہہ کی

گاد(.sediment) تہہ بتہہ جمع ہو رہی ہے، اور میلوں پاٹتی چلی جا رہی ہے، اس لئے کسی وقت عدم توازن کی بنا پر ہو سکتا ہے، کہ سمندر کے نیچے اتھاہ گہرائیوں میں جمع ہونے والے مادے کا دباؤ پڑنے سے نئے پہاڑ ابھر آئیں یا نئے جزائری سلسلے پیدا ہو جائیں، ساحل کے بعض پہاڑوں میں اس طرح کی سمندری گاد کے نشانات پائے گئے ہیں، مگر انسان کی موجودہ معلومات کے دائرے میں کوئی بھی نظریہ سمندری خندقوں کی مکمل توجیہہ نہیں کرتا، یہ دائمی سرد اور دائمی تاریک غار جو فی انچ سات ٹن بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، وہ ابھی انسان کے لئے سمند دوسرے معرکوں میں سے ایک معما ہیں۔'' (the world we live in (n.y.1965).

2۔ اسی طرح قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ زمین پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھاڑ کر پھیلا دیا۔

والارض بعد ذالك دحها اخرج منها ماء ها و مرعاها۔

(النازعات ۳۱)

اس کے بعد خدا نے زمین کو پھیلایا اور اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

یہ الفاظ جدید ترین نظریہ انتشار براعظم (theory of drifting continents.) کے عین مطابق ہیں، اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تمام براعظم کسی زمانے میں ایک ہی بڑی زمین کے حصے تھے، اس کے بعد وہ پھٹ کر سطح زمین پر ادھر ادھر پھیل گئے اور بھرے ہوئے سمندروں کے اردگرد براعظموں کی ایک دنیا آباد ہو گئی۔

اس نظریہ کو پہلی بار باقاعدہ طور پر ۱۹۱۵ء میں ایک جرمن ماہر ارضیات

الفرڈ ویجنر (alfred wegener.) نے پیش کیا، اس کی دلیل یہ تھی کہ براعظموں کو اگر قریب کیا جائے تو وہ سب کے سب ''jigsaw puzzle'' کی طرح آپس میں جڑ جاتے ہیں (مثلاً جنوبی امریکہ کا مشرقی ساحل افریقہ کے مغربی ساحل سے مل رہا ہے)

اس قسم کی اور بہت سی مشابہتیں ہیں جو وسیع سمندروں کے دونوں طرف پائی گئی ہیں، مثلاً ایک قسم کے پہاڑ یکساں ارضیاتی سال کی چٹانیں، ایک قسم کے جانور اور مچھلیاں اور ایک طرح کے پودے، چنانچہ علم نباتات کا ماہر پروفیسر رونا لڈ گڈ (ronal good.) اپنی کتاب موسومہ (geography of the flowering plants) میں لکھتا ہے:۔

''نباتات کے ماہرین کا تقریباً متفقہ نظریہ ہے کہ مختلف پودے جو زمین کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ان کی توجیہہ اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی کہ ہم یہ فرض کریں کہ زمین کے ٹکڑے ماضی میں کبھی باہم ملے ہوئے تھے۔''

اور اب تو ہجری کشش (fossil magnetism.) سے تصدیق حاصل ہونے کے بعد اس کو قطعی سائنسی نظریہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، پتھر کے ذرات کے رخ کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کر لیا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اس کی چٹان کا عرض البلد اور طول البلد کیا تھا، اس مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ زمین کے موجودہ ٹکڑے ماضی میں ان مقامات پر نہیں تھے، جہاں براعظموں کے انتشار کا نظریہ تقاضا کرتا ہے، امپریل کالج (لندن) میں فزکس کے استاد پروفیسر پی، ایم، ایس، بلیکٹ (blacket.) نے کہا ہے:۔

''ہندوستانی پتھر کی پیمائش یقینی طور پر بتاتی ہے کہ ستر ملین سال پہلے ہندوستان خط استوا کے جنوب میں واقع تھا، جنوبی افریقہ کی

چٹانوں کا مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ افریقی براعظم تین سو ملین سال پہلے قطب جنوبی سے ٹوٹ کر نکلا ہے۔'' (تفصیل کے لئے، ریڈرز ڈائجسٹ، جون ۱۹۶۱ء)

اوپر ہم نے جو آیت نقل کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے ''دحو'' کا لفظ استعمال کا ہے، دحو کے معنی ہیں کسی مجتمع چیز کو پھیلانے اور بکھیر دینے کیہیں، عربی میں کہا جاتا ہے'' رجا المطر الحصی عن وجہ الارض'' (بارش زمین پر سے کنکریوں کو بہالے گئی)تقریباً یہی مفہوم انگریزی لفظ'' drift'' کا بھی ہے، جو اس جغرافی تعبیر کیلئے موجودہ زمانے می اختیار کیا گیا ہے، قدیم ترین ماضی اور حال میں اس حیرت انگیز یکسانیت کی توجیہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ ایسی ہستی کا کلام ہے، جس کا علم ماضی اور حال سب پر محیط ہے۔

غذائیات:۔

کتاب الٰہی میں انسان کے لئے جو مینو بتایا گیا ہے، اس کے مطابق خون ہمارے لئے حرام ہے، نزول کتاب کے وقت تک انسان اس قانون کی غذائی اہمیت سے بے خبر تھا، لیکن بعد کو جب سائنسی طور پر خون کے اجزاء کی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ قانون نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا، سائنسی تجربہ نے اس کو رد نہیں کیا، بلکہ اس کی معنویت ہم پر واضح کی۔

یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ خون میں کثرت سے یورک ایسڈ (uric acid.)موجود ہیں، جو ایک تیزابی مادہ ہونے کی وجہ سے خطرناک زہریلی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے، اور غذا کے طور پر اس کا استعمال سخت مضر ہے، ذبیحہ کا مخصوص طریقہ جو اسلام میں بتایا گیا ہے، اس کی مصلحت بھی یہی ہے، اسلامی اصطلاح میں ذبیحہ سے مراد جانور کو خدا کے نام پر ایسے طریقہ سے ذبح کرنا ہے جس سے اس کے جسم کا سارا خون نکل جائے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ جانور کی صرف شہ رگ کو کاٹا جائے لیکن گردن کی رگوں کو

قائم رکھا جائے تا کہ مذبوحہ کے دل اور دماغ کے درمیان موت تک تعلق قائم رہے، اور جانور کی موت کا باعث صرف کامل اخراج خون ہو نہ کہ کسی اعضائے رئیسہ پر صدمہ کا پہنچنا کیونکہ کسی اعضائے رئیسہ مثلاً دماغ، دل یا جگر کے صدمہ رسیدہ ہونے سے فیالفور موت تو وارد ہو جاتی ہے، لیکن ایسی صورت میں خون آناً فاناً جسم میں مجمد ہو کر تمام گوشت میں سرایت کر جاتا ہے، اور سارا گوشت یورک ایسڈ کی آمیزش کی وجہ سے زہریلا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سور کو بھی حرام کیا گیا، زمانہ قدیم میں انسان کو اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا، مگر جدید طبی تحقیقات نے بتایا ہے کہ اس کے اندر بہت سے نقصانات ہیں، مثلاً مذکورہ بالا یورک ایسڈ جو ایک زہریلا مادہ ہے اور ہر جاندار کے خون میں موجود رہتا، وہ اور جانداروں کے جسم سے تو خارج ہو جاتا ہے مگر سور کے اندر سے خارج نہیں ہوتا، گردے جو ہر انسانی جسم میں ہوتے ہیں، اس زہریلے مادے کو پیشاب کے ذریعے خارج کرتے رہتے ہیں، انسانی جسم اس مادے کو نوے فیصدی خارج کر دیتے ہیں، مگر سور کے جسم کے عضلات کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے خون کا یورک ایسڈ صرف دو فیصدی ہی خارج ہو پاتا ہے، اور بقیہ حصہ اس کے جسم کا جزو بنتا رہتا ہے، چنانچہ سور خود بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا ہے، اور اس کا گوشت کھانے والے بھی وجعالمفاصل جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کی مثالیں کثرت سے قرآن وحدیث میں موجود ہیں اور یہ مثالیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا ہے، بعد کی معلومات نے حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق کی ہے جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

''عنقریب ہم آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔'' (قرآن)

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں، اور اس کا تعلق انگلستان سے ہے:

''۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا، اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمرج کی مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (james jeans.) پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے، میں نے قریب ہو کر سلام کیا، انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ''تم کیا چاہتے ہو'' میں نے کہا، دو باتیں اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں دبائے رکھا ہے سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا، دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لئے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا ''آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو'' چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پر پہنچا ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں ''سر جیمز تمھارے منتظر ہیں'' اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب خیالات میں کھوئے ہوئے تھے کہنے لگے ''تمھارا سوال کیا تھا'' اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بیانتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستان کبریا و جبروت پر دہلنے لگا، اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش

کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی، فرمانے لگے ''عنایت اللہ خان! جن میں اللہ کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے، اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ''تو بہت بڑا ہے'' تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے، مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے، مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنایت اللہ خان! تمھاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں۔''

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا دیا میں نے کہا ''جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں، اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی اگر اجازت ہو تو پیش کروں، فرمایا ''ضرور'' چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:۔

ومن الجبال جدود بیض و حمر مختلف الونھا و غرابیب سودة و من الناس والدواب والانعام مختلف الونه کذلك انما یخشی الله من عباده العلماء (فاطر ۲۷۔ ۲۸)

ترجمہ:۔ پہاڑوں میں خطے ہیں، سفید اور سرخ اور طرح طرح کے رنگ کے اور کالے اور آدمیوں میں کیڑوں میں اور چوپاؤں میں، اسی طرح مختلف رنگ ہیں، اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اس کے بندوں میں جو علم رکھتے ہیں۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:۔

''کیا کہا۔۔ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم

ہوئی محمد کو کس نے بتائی، کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے، اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے، محمد ان پڑھ تھا، اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی، اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی، بہت خوب، بہت خوب۔۔۔"

(نقوش، شخصیات نمبر ۹۔۱۲۰۸)

.....

فٹ نوٹ:۔

صفحہ نمبر ۱۴۶ mohammad the holy prophet by h.g.sanwarp.448.

صفحہ نمبر ۱۵۰ a study of history {abridgement}p.447.

صفحہ نمبر ۱۵۳ aslam and ats founder,p.228.

۲۔الروم۔۳۲

صفحہ نمبر ۱۵۴ western civilisation,p.210.

صفحہ نمبر:۔۱۵۹ (talent) یونانیوں اور رومیوں کا ایک قدیم وزن۔

صفحہ نمبر:۔۱۶۰ (۱) آرکے ڈیس (۴۰۸۔۳۷۸) رومی سلطنت کا ایک تاج دار جو ۳۹۵ء میں تخت نشیں ہوا۔

۲۔جولیس سیزر (۴۴، ۱۰۲ ق م) عظیم رومی فوجی اور سیاست داں۔

صفحہ نمبر:۔۱۶۳: اعجاز قرآن پر انسائکلو پیڈیا آف ریلجین اینڈ ایتھکس کے مندرجہ ذیل حصے قابل ملاحظہ ہیں۔

مقالہ (quran.) ج ۱۰ ص ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۵۔

صفحہ نمبر:۔ man does not stand alone,p.120.

صفحہ نمبر:۔۱۷۲: رق۔۔منضم الاجزاء

صفحہ نمبر ۱۷۳: ایٹم کی ساخت کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۲۶۔

صفحہ نمبر ۱۷۵: شق قمر کا واقعہ صحیحین میں اور دوسری کتب حدیث میں مستند روایات سے بیان کیا گیا ہے، ان راویوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ہیں، جو بذات خود اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں، اس کے باوجود شق قمر کا مسئلہ قدیم مفسرین و متکلمین سے لے کر اب تک شدید بحث کا موضوع رہا ہے، اکثریت کی رائے یہ ہے کہ شق قمر کا واقعہ

ہوا ہے، اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قیامت کے قریب ہوگا (قال بعض المفسرین سینشق تفسیر کبیر) اس دوسرے گروہ میں امام حسن بصری بھی شامل ہیں جن کا قول ابوحیان اندلسی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

ان المعنی اذا جاءت الساعۃ انشق القمر ''اقتربت الساعۃ وانشق کا مطلب یہ ہے کہ بعد البعثۃ الثانیۃ ۔ (البحر المحیط ثامن صفحہ ۱۷۳) جب قیامت قریباً آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اور یہ واقعہ دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد ہوگا۔

ان دونوں خیالات میں تطبیق کی صورت لوگوں نے یہ نکالی ہے کہ انھوں نے ان دونوں کو تسلیم کرلیا ہے، ان کے خیالات کے مطابق احادیث میں منیٰ کے ایک مجمع کے سامنے جس شق قمر کا ذکر ہے، وہ بھی ایک واقعہ ہے خواہ وہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق بصری تصرف کے تحت ہوا ہو، یا فی الواقع کوئی فلکیاتی انشقاق ہو، اور قیامت کے قریب شق قمر کی بات بھی صحیح ہے پہلا واقعہ گویا ایک ابتدائی علامت ہے، اس واقعہ کی جو قیامت میں آخری شکل میں ظاہر ہوگا، علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں: ''شق القمر کا معجزہ ایک نمونہ اور نشانی تھی، قیامت کی کہ آگے سب یوں ہی پھٹے گا۔''

o . r . v o n

engein,geomorphology(n.y. 1948)p. 26-27.

صفحہ نمبر ۱۸۱: یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی غذا، خواہ وہ مفید ہو یا مضر، جب اس کی تاثیرات بتائی جاتی ہیں تو یہ صرف اس کی انفرادی تاثیر کا بیان ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب وہ کھائی جائے تو لازمی طور پر فوراً ہر شخص میں وہی اثر بھی ظاہر کرے جو انفرادی مطالعہ میں ہم نے اس کے اندر پایا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عموماً کسی چیز کو تنہا شکل میں اس طرح نہیں کھاتا کہ صرف اسی کو اکیلے عمل کرنے کا موقع ملے بلکہ مختلف چیزوں کے ساتھ ایک چیز کو پیٹ میں داخل کرتا ہے، اسی طرح اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کے عمل اور ردعمل سے اکثر ایک چیز کی انفرادی تاثیر گھٹ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات ختم بھی ہو جاتی ہے، تاہم جب کسی چیز کی ذاتی خصوصیات کا تجزیہ کیا جائے تو وہی بات کہی جائے گی جو انفرادی طور پر اس کے اندر ثابت ہو رہی ہو۔

مذہب اور تمدنی مسائل

تمدنی مسائل کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کا قانون کیا ہو، تمدنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں، اوران روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کر سکا، کہنے کو اگر چہ ساری دنیا میں قانون حکومتیں قائم ہیں، مگر یہ تمام ''قوانین'' نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں، یہ ایک حقیقت ہے، کہ رائج الوقت قوانین اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں۔ فلر (l.l.fuller.) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے، اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''قانون خود اپنی تلاش میں''

(the law in ques of itself.)

دور جدید میں ان مسائل پر بے سارلٹریچر تیار ہوا ہے، بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کے لئے صرف کر رہے ہیں، اور چیمبرز انسائکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں ''قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہونچا دیا ہے۔'' مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں، حتیٰ کہ ایک عالم قانون کے الفاظ میں ''اگر دس قانون دانوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے لئے تیار رہنا چاہیے'' ماہر قانون کی مختلف اقسام کو الگ الگ کرنے کے لئے انھیں مختلف مکاتیب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین تقسیم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے، مثال کے طور پر جان آسٹن (john austin.) کے متعلق پروفیسر پیٹن (g.w.paton.) نے لکھا ہے کہ وہ ہماری وسیع

قسم بندی (broad divisions.) میں سے کسی ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔"

(A text book of jurisprudence(1905)p,5.)

اس اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کر سکیں، وہ قانون کے اندر جن ضروری قدروں کو یک جا کرنا چاہتے ہیں، جب وہ انھیں یک جا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یک جا نہیں ہو رہی ہیں، اس سلسلے میں ماہر قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو مینڈکوں کی پنسیری بنا رہا ہو ظاہر ہے کہ وہ پانچ مینڈکوں کو یک جا کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پلڑے سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے، اس طرح میعار قانون کو حاصل کرنے کی کی اب تک کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں، فرائڈ مین (w.friedmann.) کے الفاظ۔"

"یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔"

(legal theory,p.18.)

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون، قانون نہیں بنتا، اس لئے اس نے قانون کی تعریف یہ کی:۔

"قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (political superior.) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (political inferior.) کے لئے نافذ کیا ہو۔"

(aText book of jurisprudence.,p.56.)

اس تعریف میں قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان (command of the sovereign.) بن کر رہ گیا۔"

(پیٹن صفحہ ۶)

چنانچہ اس کے بعد اس پر شدید اعتراضات کئے گئے، نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے، چنانچہ ایسے علمائے قانون پیدا ہوئے جنھوں نے کسی ایسے ضابطہ وقاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جس کی پشت پر قوم کی رضامندی نہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہل علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لئے رائج نہیں ہوسکتا کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے، مثلاً امریکہ میں شراب کی پابندی کیقانون کو امریکی قوم کی رضامندی نہ ملنے کیوجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی، اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزا میں ترمیم کرنی پڑیاورہم جنسی جیسی قبیح حرکت کوقانون کی حد میں لانا پڑا، حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے، اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے کہ، قانون قابل تغیر ہے یا نا قابل تغیر۔ قرون وسطی اور زمانہء ما قبل تجدید (post.renaissance period.) میں قانون طبعی یا قانون فطرت کوکافی فروغ حاصل ہوا، اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جوفطرت ہے وہی قانون کابہترین ماخذ ہے:۔

فطرت کاتقاضایہ ہے کہ ہرشے پرحکومت کاحق خوداسی فطری تقاضوں اوررہنما اصولوں کوپہونچتاہے، اورانسان کے لئے قدرت نے یہ رہنما اصول اس کی عقل کی شکل میں پیدا کئے ہیں لہذا انسان پرحکومت خوداپنی عقل کے زورسے ہی قائم کی جا سکتی ہے۔"

jurisprudence by bodenheimer,p.164.)

اس تصور نے قانون کوایک آفاقی بنیادفراہم کردی یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہیے، یہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کا تصورقانون تھا، اس کے بعد دوسرا مکتب فکر پیدا ہوا اوراس نے دعویٰ کیا کہ قانون

کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہیں، کوہلر (kohler.) لکھتا ہے۔

"یہاں کوئی ابدی قانون (eternal law.) نہیں ہے, ایک قانون جو ایک عہد کے لئے موزوں ہو، وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا، ہم صرف اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہر کلچر کیلئے اس کے مناسب حال نظام قانون کو فراہم کریں، کوئی چیز جو ایک کے لئے خیر ہو، وہی دوسرے کے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔"

(philosphy of law ,p.5.)

اس تصور نے فلسفہ قانون کا سارا استحکام ختم کر دیا، یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری (relativism.) کی طرف لے جاتا ہے، اور چونکہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے، اس لئے اس کی کوئی منزل نہیں،، یہ تصور زندگی کی تمام اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے، پھر ایک گروہ نے ہر طرف سے سمٹ کر عدل کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی۔۔ لارڈ رائٹ (لہر دوریگھت۔) ڈین راسکو پاونڈ (dean roscoe pound.) کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"راسکو پاونڈ ایک ایسی بات کہتا ہے جس کی صداقت پر میں اپنے تجربات اور قانون مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں، وہ یہ کہ قانون کا ابتدائی اور بنیادی مقصد انصاف کی تل (quest of justice.) ہے۔"

(interpretation of modern legal philosophies(n,y.1947)p.794.)

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے، اور اس کو کیسے متعین کیا جا سکتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہنچ جاتی ہے، جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا، اس طرح سینکڑوں برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لئے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کر سکا، یہ احساس روز بروز بڑھ رہا

ہے کہ جدید فلسفہ مقاصد کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے، پروفیسر پیٹن (george whitecross paton.) لکھتے ہیں:۔

''کیا مفادات (interests.) ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جو اقدار (values.) سے متعلق ہے، اور فلسفہ قانون کے دائرہ بحث میں آتا ہے، مگر اس معاملہ میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا اس کا حصول مشکل معلوم ہوتا ہے کوئی بھی قابل قبول پیمانہ اقتدار (scale of velues.) اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اس کی ایک بنیاد پا سکتے ہیں، مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں، نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔''

(Atext book of jurisprudence,p.104.)

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفہ قانون کی بھول بھلیاں میں گردش کرنیکے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ فلسفہ قانون نے قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے، وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتی (صفحہ ۱۰۶) پھر وہ سوال کرتا ہے۔ ''کیا کچھ معیاری اقدار (Ideal values.) ہیں، جو ارتقائے قانون میں اسکی رہنمائی کرتی ہیں''۔ (صفحہ ۱۰۸) ایسی اقدار اگرچہ اب تک دریافت نہیں ہوسکیں لیکن وہ قانون کے لئے ناگزیر ہیں، مگر دقت یہ ہے کہ، مذہب کو الگ کرنے کے بعد اس کیھول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

the orthodox natural low theory based its absolutes on the revealed truths of religion.if we attempt to secularise jurisprudence,where can we find an agreed basis of values?(p.109)

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے، جہاں سے اس نے انحراف کیا تھا، قدیم زمانے میں قانون کی تدوین وتشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا، چنانچہ تاریخ قانون کا ماہر سر ہنری مین (sir henry maine.) لکھتا ہے:۔

''تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، چین سے پیرو (peru.) تک ہمیں نہیں ملتا جو دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم و عبادات کے ساتھ ہم رشتہ نہ رہا ہو۔''

(Early law and custom,p5.

اب وقت آ گیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کرسکتا، لاحاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کی بجائے اب ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر فرائڈ مین کے الفاظ میں ہم اعتراف کر لیں کہ

''ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، کہ انصاف کے حقیقی میعار کو معین کرنے کے لئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بیفائدہ ہوگی، اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر تمشکل کرنے کے لئے مذہب کی دی ہوئی اساس بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔''

legal theory,p.450.

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنایدیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں، جو ایک میعاری قانون کے لئے ماہرین تلاش کررہے ہیں، مگر وہ اب تک اسے نہ پا سکے۔

ا۔ قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے، وہ کون ہو جس کی منظوری (sanction.) سے کسی قانون کو قانون کا درجہ عطا کیا جائے، ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے، اگر حاکم کو بحیثیت حاکم

یہ مقام دیں تو نظری طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمالوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جا چاہے، قانون بنائے اور جس طرح چاہے نافذ کرے، اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو" قانون ساز" قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے، کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم وعقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کیلئے ضروری ہے، قانون بنانے کے لئے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحت ہوتی ہے، اور نہان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں درک حاصل کرسکیں، اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا کہ پوری آبادی یعاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمایندے کی حیثیت سے اجتماع کے لئے قانون بنائیں، مگر اساصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ ۵۱ فیصد کو صرف دوعدد کیا کثریت کی بناپر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ ۴۹ فی صدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس طریقہ کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۵۱ فی صدی ک اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے، مثال کے طور پر ہندوستان میں اس وقت ہم جس حکومت کے تحت ہیں، وہ ۱۹۶۷ء میں تیسرے عام الیکشن کے ذریعے برسر اقتدار آئی، کانگرس کو ملک میں یہ اقتدار ۷۰ فی صدی نشستوں پر قبضہ کرکے حاصل ہوا ہے، جب کہ اس کو ووٹ صرف چالیس فی صدی ملے تھے، یہی حال آزادی کے بعد پچھلے دنوں الکشنوں کا بھی تھا، ہر بار کانگرس کو پچاس فیصد سے کم ووٹ ملے، مگر اس کے باوجود ہر بار اسی نے حکومت بنائی اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ ووٹ پچاس فی صدی سے زیادہ ہونے کے باوجود مختلف

پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگرس کے رائے دہندگان کی تعداد زیادہ تھی، صرف اشتراکی ملکوں کے مصنوعی انتخابات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس طرح فلسفہ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعیحق معلوم نہ ہو سکا، مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون ماخذ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبعیی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے، اسی کو حق ہے کہوہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے، اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جس کو یہ حیثیتد یجا سکے، یہ جواب اتنا سادہاور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب نہیں ہوسکتا، یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راستآ رہا ہے، جیسے کوئی ڈھکن غلط شیشیوں پر بیٹھ نہ رہا ہو، اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں نہ پہونچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کو کہاں لے جائیں، انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جا سکتا، اس کا حق تو صرف اسی کو ہے جو سارے انسانوں کا حاکم اور بالفعل ان کا طبیعی حاکم ہے۔

۲۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے یا اس کا کوئی جزو حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہکہ ہر قانون جو آج رائج ہے کل بدلا جا سکتا ہے یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو نا قابل تغیر ہے، اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہوسکی، علمائے قانون اصولی طور پر اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزا بھی ہونے چاہیں جن میں لچک ہو تا کہ بدلتے ہوئے حالات پر انھیں بآسانی منطبق کیا جا سکے۔۔۔

دونوں میں سیکسی ایک ہیلو کی کمی بھی قانون کیلئے سخت مضر ہے، امریکہ کے ایک جج مسٹر کرڈوزو (justice cardozo.) لکھتے ہیں:۔

''آج قانون کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفہ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کی متحارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔''

(the growth of the law.)

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے:۔

''قانون کو ضرور مستحکم ہونا چاہیے، لیکن اس کیباوجود اس میں جمود پیدا ہونا چاہیے، اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جدوجہد کی ہے، کہ کس طرح استحکام اور تبدیلی کے دوطرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔''

roscoe pound, interpretations of legal history,p.1.

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے کہ کیونکہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور نا قابل تغیر ہے، کوئی دلیل چاہتا ہے، اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائمی قرار دیں گے، اور کل کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے، اور وہ دوبارہ اس کے قابل تغیر ہونے کا اعلان کردیں گے۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے، خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزو ہونے چاہیئں، یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے، اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے، اور اس طرح وہ اس فرق کا تعین کردیتا ہے کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی ہے اور کون سا حصہ قابل تغیر ہے، پھر وہ خدا

کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کا ایک بہت بڑی دین ہے، بلکہ ایک ایسی دین ہے، جس کا بدلہ فراہم کرنا انسان کیلئے قطعی ناممکن ہے۔

۳۔ اسی طرح قانون کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی چیز کو ''جرم'' قرار دیتا ہے۔۔۔ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمامن عامہ یا ''نظم مملکت'' میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے، اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے یہی وجہ ہے کہ قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اس وقت جرم بنتا ہے جب کہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو، گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے۔۔۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے،، اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے لیکن، باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لئے جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے، اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون، زنا کا حامی و محافظ بن جاتا ہے، اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انھیں روکنا چاہے تو الٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے، وہ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے، وہ رشتہ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے، وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے، وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل و دماغ کو گندا کر دیتا ہے، مگر اس کے باوجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کے پاس زنا بالرضا کو جرم قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد

نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے، کیونکہ اکل وشرب انسان کا ایک فطری حق ہے، اس لئے وہ جو چاہے کھائے، اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت، سا لئے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے اور نہ اس سے پیدا شدہ بدمستی اصلاً قابل مواخذہ ہے، البتہ نشہ کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوج کر بیٹھا یا ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی، یا شارع عام پر وہ اس طرح جھومتا ہوا کہ خمار اس کی حرکات سے بالکل نمایاں تھا تب کہیں جا کر قانون اس پر ہاتھ ڈالنا جائز سمجھے گا، گویا انسانی قانون کی رو سے فی الحقیقت شراب نوشی فعل قابل گرفت نہیں ہے، بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہونچانا ہے۔

شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جاسکتی ہے، اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے، اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے، شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مفلوج ہو جاتے ہیں، اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر قانون اسے بند نہیں کرسکتا، کیوں کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل وشرب پر پابندی عائد کرے۔

اس مشکل کام کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے، کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے، کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کے لئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں، اس طرح خدائی قانون قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کس فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

۴۔ قانون کبھی خود مقتضی نہیں ہوسکتا، مختلف وجوہ کی بنا پر اس کے ساتھ اخلاق کا ہم رشتہ ہونا ضروری ہے۔

(الف) مثلاً ایک مقدمی قانون کے سامنے آتا ہے اس وقت اگر خالص سچائی منظر عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا، اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوگیں گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون تصور کی لازمی ضرورت ہے جو لوگوں کے لئے سچ بولنے کا محرک بن سکے، سچائی کے لازمہ قانون و انصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف اٹھا کر اپنا بیان دے، قانون کے لئے مذہبی اعتقادت کی اہمیت چونکہ ہر پہلو سے ختم کر دی گئی ہے، اس لئے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ پن بن کر رہ گئی ہیں، اور ان کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا چاہتا ہے، اس کے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہے، محض قانونی کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہوسکتی جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لئے درکار ہے، ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر مجرمانہ احساس (guilty mind.) کا پایا جانا ضرورہ ہے، وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے، پولیس پورے انداز کے ساتھ اس پر دست درازی کرے، عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگی قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جاری کرے، دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے ''جرم'' ہونے کے لئے اس کا ''گناہ'' ہونا ضروری ہے، قانون کے تاریخی مکتب فکر کا یہ کہنا ہے کہ۔۔ ''قانون سازی جبھی کامیاب ہوسکتی ہے جب وہ اس نسل کے داخلی

اعتقادات (internal convictions.) کے مطابق ہو جس کے
لئے قانون وضع کیا گیا ہے، اگر وہ اس سے غیر متعلق ہو تو ایسے قانون کا ناکام ہونا یقینی ہے۔''

اپنے مخصوص مکتب فکر کے استدلال کے طور پر تو صحیح نہیں ہے مگر اس میں ایک خارجی صداقت بے شک موجود ہے۔

(ج) ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روکتے ہوں، صرف پولیس اور عدالت کا خوف اس کے لئے کافی محرک نہیں بن سکتا، کیونکہ پولیس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت، سفارش، غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی بچا سکتی ہیں، اگر ان چیزوں کو استعمال کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو جرم کے قانونی انجام سے بچا لے جائے تو پھر اسے مذید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے، خدائی قانون کے ساتھ مذہب اور آخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے، جو لوگوں کو سچائی پر ابھارے، وہ اس درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھائے تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا، ویسٹرن سرکٹ کی عدالت میں ایک پتھر نصب ہے جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے عام کلمات دہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا'' کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کر لے'' چنانچہ وہ شخص وہی دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہو گیا، اس طرح کے واقعات اور بھی پیش آئے ہیں، اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتا، اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہے، اسی طرح جرم نہ کرنے کا محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ مذہب صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ قانون بھی لاتا ہے کہ جس

نے یہ قانون عائد کیا ہے، وہ تمھاری پوری زندگی کو دیکھ رہا ہے، تمھاری نیت، تمھارا قول، تمھاری تمام حرکتیں اس کے ایکارڈ میں مکمل طور پر ضبط ہو چکی ہیں، مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمھارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو، آج اگر بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے، بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اگر تم نے غلط کوشیشیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمھارے اوپر دہرا مقدمہ چلے گا اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروڑوں گنا سخت ہے۔

۵۔ انگلستان کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے، جیمز اول (james 1) نے اعلان کیا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کر سکتا ہے، اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر معاملات میں آخری فیصلے دے سکتا ہے، یہ مشہور چیف جسٹس لارڈ کوک (coke.) کا زمانہ تھا، وہ ایک مذہبی آدمی تھے، اور اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے، انھوں نے بادشاہ سے کہا ''تمھیں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں۔'' بادشاہ نے کہا'' میرا خیال ہے اور یہی میں نے سنا بھی ہیکہ تمھارے قوانین کی بنیاد عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے کم تر عقل ہے'' چیف جسٹس نے جواب دیا'' تم بلا شبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہو، لیکن قانون کے لئے بڑے تجربے اور مطالعہ کی ضرورت ہے، یہ تو ایک سنہرا پیمانہ ہے، جس سے رعایا کے حقوق کی پیائش کی جاتی ہے، اور خود جناب والا کی حفاظت کی جاتی ہے'' بادشاہ نے انتہائی غصہ ہو کر کہا'' کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے'' لارڈ کوک نے بریکٹن (bracton.) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:۔

''بادشاہ کسی آدمی کا ماتحت نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا ماتحت ہے۔''

(the changing law by sir alfred dennig (1953)np117-118.)

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو قانون سیا لگ کر دیں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی معقول بنیاد نہیں رہتی کہ۔ ''بادشاہ قانون کے ماتحت ہے'' کیونکہ جن افراد نے خود اپنی رایوں سے قانون بنایا ہو، جن کے اذن () سے وہ قانون طور پر جاری ہوا ہو، جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں آخر کس بنا پر وہ اس کے ماتحت ہو جائیں گے، جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہو جاتا ہے، وپ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہوتا ہے ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام جمہوریتوں میں شہری مساوات کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود قانونی طور پر سب یکساں نہیں ہیں، اگر آپ ہندوستان کے صدر، گورنر، وزیر یا کسی افسر اعلیٰ پر مقدمہ چلانا چاہیں تو آپ اسی طرح اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکتے، جیسے ایک عام شہری کے خلاف آپ کر لیتے ہیں بلکہ ایسے کسی مقدمہ کو عدالت میں لے جانے سے پہلے حکومت سے اس کی اجازت لینی ہوگی، دستور ہند کے دفعہ ۳۶۱ کے تحت صدر جمہوریہ اور ریاستوں کے گورنر کے لئے یہ تحفظ دیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کسی عدالت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے خلاف کسی دعوے کی سماعت کر سکے، اسی طرح وزراء کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے حکومت سے پیشگی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے، بلکہ تغیرات ہند کی دفعہ ۱۹۷ کی رو سے ''کوئی جج، مجسٹریٹ یا کوئی سرکاری ملازم، جو مرکزی یا صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے عہدے سے معزول نہ کیا جا سکتا ہو اگر اس کے خلاف کسی بد عنوانی کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تو اس کی سماعت کا حق کسی عدالت کو اس وقت تک نہیں ہے، جب تک مرکزی یا ریاستی حکومت سے اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے جس سے کہ اس شخص کی ملازمت متعلق ہے'' دوسرے لفظوں میں آپ کسی اعلیٰ سیاسی یا انتظامی شخصیت پر مقدمہ چلانا چاہیں تو خود اسی سے پوچھنا ہوگا کہ آپ

کے اوپر مقدمہ چلایا جائے یا نہیں۔ یہ ہندوستان کے قانون نظام کا نقص نہیں ہے بلکہ انسانی قانون کا نقص ہے، اور یہ نقص ہر اس جگہ پایا جاتا ہے، جہاں انسانی قانون سازی کا اصول رائج ہے، صرف خدائی قانون میں یہ ممکن ہے کہ ہر شخص کی حیثیت قانون کی نظروں میں بالکل یکساں ہو، اور ایک حاکم پر اسی طرح مقدمہ چلایا جا سکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے، کیونکہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہوتا ہے، بقیہ تمام لوگ یکساں طور پر زیر قانون۔

۶۔ قانون کی آخری اور سب سے بڑی خصوصیت جس کو ہمارے ماہرین صدیوں سے تلاش کر رہے ہیں، اور اب تک وہ اسے حاصل نہ کر سکے وہ بھی صرف مذہبی قانون میں موجود ہے۔ یعنی قانون کی منصفیانہ بنیاد کا حاصل نہ ہونا تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت ہے نا کہ اس بات کا ثبوت کہ انسان اسے حاصل ہی نہیں کر سکتا، مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ طبعی قوانین کی دریافت میں اس درجہ کی بلکہ اس سے زیادہ کوششوں کے باوجود ایک فی صدی بھی کامیابی نہیں ہوئی، تو ہم یہ ماننے پر مجبور پوتے ہیں کہ یہ محض تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے کہ جو چیز تلاش کی جا رہی ہے اس کا پانا انسان کے بس ہی میں نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلا فوٹو فرانسیسی سائنس داں نے ۱۸۲۶ء میں کھینچا تھا، لیکن تصویر کشی کی موجودہ رفتار کا حال یہ ہے کہ فلم کا ریکارڈنگ کیمرا ایک سیکنڈ میں ایک ہزار سے بھی زیادہ تصویریں کھینچ لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے جتنی دیر میں صرف ایک تصویر کھینچی جا سکتی تھی، اتنی دیر میں آج چھ کروڑ تصویریں لی جا سکتی ہیں، گویا رفتار کے معاملے میں ۱۴۰ سال میں انسان نے چھ کروڑ گنا ترقی کی ہے، امریکہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں سارے ملک میں صرف چار موٹر کاریں تھیں۔۔۔ اب تقریباً دس کروڑ کاریں وہاں کی سڑکوں پر دوڑتی ہیں، انسان کی باریک بینی کا یہ حال ہے کہ آج وہ۔۔۔ 1/10 سکنڈ کو بھی ہزارویں حصے تک تقسیم کر

سکتا ہے یعنی ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے کا ہزارواں حصہ چنانچہ زمین کی گردش میں فرق پڑنے سے اگر ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصے کے بقدر دن چھوٹا بڑا ہوتو رصدگاہوں میں اسے معلوم کرلیا جاتا ہے، آج ایسے حساس آلے دریافت ہو چکے ہیں کہ اگر تیس جلدوں کی انسائیکلو پیڈیا میں کسی ایک صفحہ پر دو الفاظ بڑھائے جائیں تو اس کی سیاہی سے وزن میں جو فرق پڑے گا، اس کو وہ فوراً بتا دیں گے۔ یہ طبعی قوانین کی دریافت میں انسان کی ترقی کا حال ہے، مگر جہاں تک تمدنی قوانین کا معاملہ ہے، وہ اس میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

یہاں میں چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ صرف خدائی مذہب ہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس سے ہم انسانی زندگی کا قانون اخذ کر سکتے ہیں۔

معاشرت:۔

اسلام کی نظر میں عورت مرد دونوں برابر نہیں ہیں، چنانچہ اس نے دونوں صنفوں کے درمیان آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے، اور اس کو بند کرنے کا حکم دیا ہے اس کے بعد جب سائنسی دور شروع ہوا تو اس اصول کا بہت مذاق اڑایا گیا اور اس کو دور جہالت کا یادگار قرار دیا گیا، بڑے زور وشور سے یہ بات کہی گئی کہ عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں، اور دونوں مساوی طور پر نسل انسانی کے وارث ہیں، ان کے میل جول کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنا ایک جرم عظیم ہوگا، چنانچہ ساری دنیا میں اور خاص طور پر مغرب میں اس اصول پر ایک نئی سوسائٹی ابھرنا شروع ہوئی مگر طویل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی کہ پیدائشی طور پر دونوں یکساں نہیں ہیں اس لئے دو کو یکساں فرض کر کے جو سماج بنایا جائے وہ لازمی طور پر بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ عورت اور مرد میں فطری صلاحیتوں کے زبردست نوعی

اختلافات ہیں اس لئے دونوں کو مساوی حیثیت دینا اپنے اندر ایک حیاتیاتی تضاد رکھتا ہے، ڈاکٹر الکسس کیرل، عورت اور مرد کے فعلیاتی (physiological.) فرق کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''مرد اور عورت کا فرق محض اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقہ تعلیم ہی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ اختلافات نہیں، بلکہ اختلافات بنیادی قسم کے ہیں، خود نسیجوں کی بناوٹ اور پورے نظام جسمانی کے اندر خاص کیمیائی مادے جو خصیۃ الرحم سے مترشح ہوتے ہیں، ان اختلافات کا حقیقی باعث ہیں، صنف کی ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم ایک ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہییں، حقیقت یہ ہے کہ عورت، مرد سے بالکل ہی مختلف ہے، اس کے جسم کے ہر ایک خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے، اس کے اعضاء اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کی بھی یہی حالت ہوتی ہے، فعالیاتی قوانین (physiological siderwal laws.) اتنے ہی اٹل ہیں، جتنے کہ فلکیات (world.) کے قوانین اٹل ہوتے ہیں، انسانی آرزوؤں سے ان کو بدلا نہیں جا سکتا، ہم ان کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں، جس طرح وہ پائے جاتے ہیں، عورتوں کو چاہیے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

(man the unknown,p.93.)

عملی تجربہ بھی اس فرق کی تصدیق کر رہا ہے، چنانچہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اب تک عورت کو مرد کی برابر نہ مل سکا، حتیٰ کہ وہ شعبے جو خاص طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، وہاں بھی مرد کو عورت کے اوپر فوقیت حاصل ہے، میری مراد فلمی

ادارے سے ہے، نہ صرف یہ کہ فلمی اداروں کی تنظیم تمام تر مردوں کے ہاتھ میں ہے بلکہ اداکاری کے اعتبار سے بھی مرد کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے، چنانچہ آج ایک مشہور ترین فلم ایکٹر ایک فلم کے لئے چھ لاکھ روپے لیتا ہے، جب کہ مشہور ترین فلم ایکٹرس کو چار لاکھ ملتے ہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، اگر ہم طبعی اور فلکیاتی قوانین کو تسلیم نہ کریں اور ان کے خلاف چلنا شروع کر دیں تو یہ صرف ایک واقعہ کا انکار ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمارا سر بھی ٹوٹ جائے گا اسی طرح عورت اور مرد کی جداگانہ حیثیات کو نظر انداز کر کے انسان نے جو نظام بنایا، اس نے تمدن کے اندر زبردست خرابیاں پیدا کر دیں، مثال کے طور پر اس غلط فلسفے کی وجہ سے دونوں صنفوں کے درمیان جو آزادانہ اختلاط پیدا ہوا ہے، اسنے جدید سوسائٹی میں نہ صرف عصمت کا وجود باقی نہیں رکھا بلکہ ساری نوجوان نسل کو طرح طرح کی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے، آج مغربی زندگی میں یہ بات عام ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوتی ہے، اس کو سر درد اور بے خوابی کی شکایت ہے وہ کچھ دیر اپنی تکلیفات پر گفتگو کرتی ہے، اس کے بعد ایک مرد کا ذکر شروع کر دیتی ہے جس سے وہ ابھی جلد ہی ملی تھی، اتنے میں ڈاکٹر محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ رک رہی ہے، تجربہ کار ڈاکٹر اس کی بات سمجھ کر آگے بات شروع کر دیتا ہے:۔

well,then he asked you to his flat .what did you) (say?

لڑکی جواب دیتی ہے۔

how did you know? iwas just going to tell you that.

اس کے بعد لڑکی جو کچھ کہتی ہے، اس کو ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں، چنانچہ علمائے جدید خود بھیاس تلخ تجربے کیبعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزادانہ اختلاط کے بعد عصمت وعفت کا تحفظ ایک بے معنی بات ہے چنانچہ اس کے خلاف کثرت

سیمھا مین اور کتابیں شائع کی جارہی ہیں، ایک مغربی ڈاکٹر کے الفاظ میں:۔

there can come a moment between a man and a woman when control and judgment are ampossible.

یعنی اجنبی مرد اور اجنبی عورت جب باہم آزادانہ مل رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے، جب فیصلہ کرنا اور قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی خرابیوں کو مغرب کے دردمند افراد شدت سے محسوس کر رہے ہیں، مگر اس کے باوجود اس سے اس قدر مرغوب ہیں کہ اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، ایک نہایت قابل اور مشہور خاتون ڈاکٹر میرین ہلیرڈ (DR.Marrion hiluard.) نے آزادانہ اختلاط کے خلاف سخت مضمون لکھا ہے، وہ کہتی ہیں:۔

As a doctor ,i don,t believe there is such a thing as platonic relationship between a man and a woman who are alone together a good deal.

یعنی بحیثیت ڈاکٹر میں اسے تسلیم نہیں کرسکتی کہ عورت اور مرد کے درمیان بے ضرر تعلقات بھی ممکن ہیں، مگر اس کے باوجود یہی خاتون ڈاکٹر لکھتی ہیں:۔

''میں اتنی غیر حقیقت پسند نہیں ہوسکتی کہ یہ مشورہ دوں کہ نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کا بوسہ لینا چھوڑ دیں، مگر اکثر مائیں اپنی لڑکیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرتیں کہ بوسہ صرف اشتہا پیدا کرتا ہے تاکہ وہ جذبات کو تسکین دیتا ہے۔'' (ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۵۷ء)

خاتون ڈاکٹر یہ کہہ کر بالواسطہ طور پر خدائی قانون کو کہ آزادانہ اختلاط کے ابتدائی مظاہر جو مغربی زندگی میں نہایت عام ہیں، وہ جذبات میں ٹھہراؤ پیدا نہیں کرتے، بلکہ اشتہا کو بڑھا کر مزید تسکین نفس کی طرف ڈھکیلتے ہیں اور بالآخر انتہائی جنسی جرائم تک پہنچا دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ

اس محرک شیطنت کو کس طرح حرام قرار دے

۲۔ اسی طرح اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زور وشور کے ساتھ جہالت کا قانون قرار دیا ہے، مگر تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا عین تقاضا ہے، کیونکہ چند زوجیت کے قانون کو ختم کرنا دراصل درجنوں غیر قانونی زوجیت کا دروازہ کھولنا ہے۔

یہاں میں اقوام متحدہ کیڈیموگرافک سال نامہ ۱۹۵۹ء کا حوالہ دوں گا، اس میں اعداد وشمار کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جدید دنیا میں جو صورت حال ہے، وہ یہ کہ بچے اندر سے کم اور باہر سے زیادہ پیدا ہو رہے ہیں ڈیموگرافک سال نامہ کے مطابق ان ملکوں میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فی صدی ہے، اور بعض ممالک مثلاً پناہ ما میں تو چار میں سے تین بچے پادریوں کی مداخلت یا سول میرج رجسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں، یعنی ۷۵ فی صدی حرامی بچے، لاطینی امریکہ میں اس قسم کے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

متحدہ اقوام کے اس ڈیموگرافک سال نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب نفی کے برابر ہے، چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) میں ناجائز بچوں کا تناسب ایک فی صدی سے بھی کم ہے، جب کہ متحدہ عرب جمہوریہ تمام مسلم ملکوں میں شاید سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا ہے، مسلم ممالک دور جدید کی اس عام وبا سے محفوظ کیوں ہیں، اس کا جواب متحدہ اقوام کا سال نامہ مرتب کرنے والے اڈیٹروں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت (polygamy.) کا رواج ہے، اس لئے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے، چند زوجیت کیا صول نے مسلم ملکوں کو وقت کے اس طوفان سے بچالیا ہے۔

(More out than in مطبوعہ ہندوستان ٹائمس، ۱۲ستمبر ۱۹۶۰ء)

اس طرح تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سابق خدائی اصول ہی زیادہ صحیح اور مبنی برحقیقت تھا۔

تمدن:۔

اسلام میں قتل عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں لیکن جدید دور ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا اسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقید کی جانے لگیں، ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جان ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھو دیا جائے پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے اور پھانسی کی بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جارہی ہیں۔

اسلام نے قتل کی جو سزا مقرر کی ہے، اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں ایک یہ کہ ایک شخص نے سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کر کے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی جڑ آئندہ کے لئے کٹ جائے مجرم کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئندہ اس قسم کی ہمت نہ کر سکیں، اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے، اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے، مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہو جائے تو وہ بے سہارا جاتے ہیں، ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت مل جائے تو انھیں کیا فائدہ، اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثاء مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خوں بہا دے کر انھیں راضی کر لیں، اور وہ قتل کو معاف کر دیں، اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپے کی رقم مل جائے گی، اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کر سکیں گے۔ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں

اضافہ کردے تا کہ بے سہارا ورثا ءخسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے اور اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہو گیا اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہیو ہاں جرائم گھٹنے کی بجائے اور بڑھ گئے ہیں، اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فی صدی تک اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کو منسوخ کیا گیا، اور اس کے بعد نتائج دیکھ کر دوبارہ اسے بدل دیا گیا، سیلون اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کر دیا گیا، اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئے ابتداً ءلوگوں کو ہوش نہیں آیا مگر ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں چار گھنٹے کے بحث ومباحثہ کیبعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت ۱۹۵۶ء کے قانون کو منسوخ کر کے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

معیشت:۔

مذہب، معاشیات کی جو تنظیم کرتا ہے، اس میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کا سارا ڈھانچہ بنیادی طور پر، انفرادی ملکیت کے اوپر قائم ہے، یہ نظام عرصہ تک باقی رہا، مگر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں انفرادی ملکیت کیاصول پر زبردست تنقیدیں شروع ہوئیں، یہاں تک کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی عام فضا اس کے خلاف ہو گئی، انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے درمیان سو برس تک ایسی فضا رہی گویا انفرادی ملکیت ایک مجرمانہ قانون تھا، جو دور وحشت میں انسانوں کے درمیان رائج ہو گیا، اور اب جدید علمی ترقی نے اجتماعی ملکیت کا اصول دریافت کیا ہے جو معاشیات کی بہتر تنظیم کے لئے

اعلیٰ ترین اصول ہے۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار اجتماعی ملکیت کے نظام کا تجربہ شروع ہوا، زمین کے ایک بڑے حصہ میں اس کو نافذ کیا گیا، اس کے حق میں بڑے بڑے دعوے کئے گئے، بڑی بڑی امیدیں باندھی گئی، مگر طویل تجربے سے ثابت ہو گیا کہ اجتماعی ملکیت کا نظام نہ صرف یہ کہ غیر فطری ہونے کی وجہ سے اپنے قیام کے لئے تشدد پیدا کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ وہ انسان کی ہمہ جہتی ترقی میں مانع ہے، نہ صرف یہ کہ سرمایہ داری سے بھی زیادہ ایک مرکوز اور جابرانہ نظام کا موجب ہے بلکہ خود زرعی اور صنعتی پیداوار بھی اس میں ملکیتی نظام کے مقابلے میں کم حاصل ہوتی ہے جس کے لئے آزادی اور ہمہ جہتی ترقی کی قربانی دی گئی تھی۔

یہاں میں روس کی مثال دوں گا، روس کی تمام زمینیں اس وقت سرکاری ملکیت میں تبدیل کی جا چکی ہیں، اور پورے ملک میں ''اجتماعی نظام'' کے تحت کاشت کی جاتی ہے ساری زمینیں سرکاری اور پنچائتی فارم کی صورت میں ہیں، نہ کہ نجی ملکیت کی صورت میں۔ البتہ ۱۹۳۵ء کے فیصلہ کے مطابق ہر کسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رہائشی مکان سے متصل اپنے ذاتی استعمال کے لئے ایک تہائی یا نصف ایکڑ اور بعض مخصوص صورتوں میں دو ایکڑ تک زمین پر قبضہ رکھ سکتا ہے، اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ اپنے مکان میں محدود تعداد میں گائے، بکری، بھیڑ اور مرغی وغیرہ پالے، ۱۹۶۱ء کیا عداد و شمار کے مطابق روس میں کل زیر کاشت رقبہ ۲۰۴ ملین ہیکٹر (hectares.) تھا، جس میں نجی رقبہ کی مجموعی مقدار چھ ملین ہیکٹیر تھی، یعنی کل زیر کاشت زمین کا صرف تین فی صدی حصہ مگر ۱۹۶۱ء میں آلو کی پیداوار کا جو تناسب تھا وہ حسب ذیل ہے:۔

	زیر کاشت زمین	پیداوار
اجتماعی رقبہ	۴۳،۵،۲،۰۰۰	۳،۰۸،۰۰،۰۰۰ ٹن

نجی رقبہ ۴۵،۲۶،۰۰۰ ۵،۳۵،۰۰،۰۰۰ ٹن

اس طرح نجی رقبہ پر پیداوار ہونے والے آلو کی مقدار گیارہ ٹن فی ہیکٹیر تھی، حالانکہ سرکاری فارموں کو جدید زرعی مشینیں، موزوں زمین اور معدنی کھاد وغیرہ کی وی سہولتیں حاصل تھیں جن سے نجی رقبے قدرتی طور پر محروم تھے، اسی قسم کا تناسب دوسرے اجناس کی پیداوار میں بھی پایا جاتا ہے۔

مویشیوں کی حالت اس سے بھی خراب ہے، چارہ کی کمی اور ناقص دیکھ بھال کی وجہ سے سرکاری فارموں میں کثرت سے جانور مرجاتے ہیں چنانچہ صرف ایک ریاست میں ۱۹۶۲ء کے گیارہ مہینوں میں مجموعی طور پر تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار مویشی مر گئے، اس کے مقابلے میں ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود نجی طور پر پالے ہوئے مویشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اور بااعتبار تناسب وہ سرکاری جانوروں سے زیادہ مفید ثابت ہو رہیہیں، اور زیادہ پیداوار دے رہے ہیں، چنانچہ سرکاری فارم جو کل تعداد کا ۷۵ فی صدی مرغیوں اور مویشیوں کے مالک ہیں انھوں نے نجی ذرائع کے مقابلے میں صرف دس (۱۰) فی صدی زیادہ گوشت فراہم کیا اور انڈے میں تو نجی پیداوار نے انھیں بہت پیچھے چھوڑ دیا، ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

	اجتماعی رقبہ	نجی رقبہ
گوشت	۴۸،۰۰،۰۰۰ ٹن	۳۹،۰۰،۰۰۰ ٹن
دودھ	۳،۴،۰۰،۰۰۰ ٹن	۶،۸۵،۰۰،۰۰۰ ٹن
انڈا	۶۳۰۰ ملین	۲۳،۰۰۰ ملین
اون	۲،۸۷،۰۰۰ ٹن	۷۹،۰۰۰ ٹن

حتیٰ کہ یہ محدود نجی ذرائع حکومتی مرکزوں کو غذائی اشیاء سپلائی کرتے ہیں، چنانچہ ۱۹۶۲ء میں صرف ایک ریاست میں حکومت نے اپنے دفاتر کا ۲۶ فی صدی آلو اور ۳۴ فی صدی انڈا نجی فارموں سے حاصل کیا ہے، اور اسی طرح دو چیزیں

(bulletin (germany)november 3691.))

اس اجتماعی ملکیت کا آخری انجام یہ ہے کہ روس جواز کے زمانے میں، جب کہ وہاں نجی ملکیت کا نظام رائج تھا، اناج کے معاملے میں دنیا کے چند بڑے برآمدی ملکوں میں سے تھا، اس نے ۱۹۶۳ء میں کناڈا، آسٹریلیا اور امریکہ سے پندرہ ملین ٹن گیہوں خریدا، اور یہ صورت حال مسلسل جاری ہے، چنانچہ ۵۶۔۱۹۴۱ء میں اس نے امریکہ سے بارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن غلہ خریدا ا ہے، اسی طرح بعد کے سالوں میں بھی یہی حال دوسرے اشترا کی ملک چین کا بھی ہے۔ (bulletin (oct.1963.

اس تجربے سے معلوم ہوا کہ مذہب کا قانون جس ذہن سے نکلا ہے، وہ انسانی فطرت کو زیادہ جاننے والا ہے، اور اس کے مسائل کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو تمدن کی تعمیر کے لئے ہمیں درکار ہیں، اس کا واحد اور حقیقی جواب صرف مذہب کے پاس ہے، مذہب ہمیں حقیقی قانون سازی کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ قانون کی موزوں ترین اساس فراہم کرتا ہے، وہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ صحیح ترین بنیاد دیتا ہے جس کی روشنی میں ہم زندگی کا مکمل نقشہ بنا سکیں، وہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان قانون مساوات پیدا کرنے کی واحد صورت ہے، وہ قانون کے لئے وہ نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے، جس کی عدم موجودگی میں قانون عملاً بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، وہ سوسائٹی کے اندر وہ موافق فضا پیدا کرتا ہے، جو کسی قانون کے نفاذ کے لئے ضروری ہے، اس طرح مذہب ہمیں وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی ہمیں اپنے تمدن کی تعمیر کے لئے ضرورت ہے جب کہ لامذہبیت ان میں سے کچھ بھی نہیں دیتی اور نہ حقیقتاً دے سکتی ہے۔

فٹ نوٹ: ۔ صفحہ نمبر ۹۵۱: (۱) a text book of juris prudence,p.15.

(2)- the changing law ,p.103

صفحہ نمبر ۲۰۵ (۱) انفرادی ملکیت کا نظام جو ساری دنیا میں جاری ہوا وہ دراصل مذہب ہی کے اثر کا نتیجہ تھا، اور اسی لئے مارکس اور اس کے تبعین نے مذہب کی شدید مخالفت کی کیونکہ اس کے بغیر وہ انفرادی ملکیت کی اہمیت کو ذہنوں سے نکال نہیں سکتے تھے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

فریڈرش انگلس نے کہا ہے۔ ''آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے ماس کے بعد ہی وہ فلسفہ و سیاست کے مسائل پر غور کر سکتا ہے۔'' مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوال ہے کہ ''میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوگی'' یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں، آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں، سورج اس کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے، اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ہوا اس کو بخشی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو، وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لئے اس دنیا میں آ گیا ہوں، ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے، مگر انسان بہر حال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔

انگلس کو دنیا ایک ملحد انسان کی حیثیت سے جانتی ہے، مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردعمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا، اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری، مگر جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہو گئی، اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے خط میں اس طرح لکھتا ہے:۔

''میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے، جب سے میرے دل میں شکوک پیدا

ہوئے ہیں یہی دعا کرنا میرا مشغلہ ہے، میں تمھارے عقیدے کو قبول نہیں کرسکتا میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے اُمڈ چلا آ رہا ہے، میری آنکھیں رو رہی ہیں لیکن مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں راندہ درگاہ نہیں ہوں، مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا جس کے دیدار کا میں دل و جان سے متمنی ہوں، اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے، یہ روح القدس کی جھلک ہے، اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔''

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں ابھرا تھا، مگر اس کو تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے، وہ اس لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے ''خدا میرا خالق ہے'' اور میں اس کا بندہ ہوں۔'' یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اول روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے، ایک پیدا کرنے والا آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے، اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے کہ جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا، اسے پا لے، اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کی صحیح مرجع کو پا لینا ہے، اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کر دے، ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو جب ہندوستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر لک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا ہے، تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں

آنسو آ گئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے، یہ آنسو دراصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا۔۔ یہ اپنے معبود کو پا لینے کی خوشی تھی، جس کے لئے انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا، اسی طرح ایک لیڈر جب قوم کے باپ کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتا ہے، اور اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے، تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے جو جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لئے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے، ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے، اور اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدے کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے، اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بنائے اور اپنے جذبات اس کے آگے پیش کرے۔

مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں، اور ''ان الشرک لظلم عظیم'' (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا مثلاً ڈبہ کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں یہ ظلم ہوگا، گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لئے خدا کو چھوڑ کر کسی اور طرف لپکتا ہے، جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے، وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے، اس لئے ابتداءً وہ شئ فطری شکل میں ابھرتا ہے، اس کا پہلا رخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے، مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں، اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے، مانوس ہو جاتا ہے تو اس میں اس کو لذت ملنے لگتی ہے، برٹ رینڈرسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا، وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا۔۔۔ اسی زمانے میں

ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا۔۔ ''تمھاری پسندیدہ دعا کون سی ہے'' چھوٹے رسل نے جواب دیا ''میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں'' اس زمانے میں خدا برٹ رینڈ رسل کا معبود تھا، لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے جذبات ابھرنے لگے، اور اب برٹ رینڈ رسل ایک ملحد انسان ہے جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ ہیں، ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے، بی، بی سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے؟ رسل نے جواب دیا ''جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا، جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں۔۔ یہ ایک ابدی دنیا تھی، وقت کی قید سے آزاد دنیا، مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا۔''

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا، مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا، اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لئے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کو صفت ہو سکتی ہے۔۔ ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا جو دراصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔

''نہرو رکوع میں'' اگر یہ خبر کسی دن اخبار میں چھپے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ واقعہ ہے لیکن ہندوستان ٹائمس (دہلی) کی ۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت کے آخری صفحہ پر شائع شدہ تصویر اس کی تصدیق کر رہی ہے اس تصویر میں نظر آ رہا ہے کہ

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو دوزانو ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر رکوع کی مانند جھکے ہوئے ہیں، یہ گاندھی کے جینتی کے موقع کی تصویر ہے، اور نہرو راج گھاٹ میں گاندھی سادھی پر قوم کے باپو کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

اس قسم کے واقعات ہر سال اور ہر روز ساری دنیا میں ہوتے ہیں، لاکھوں ایسے لوگ جو خدا کو مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں۔۔وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبہ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ''الہ'' انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے، انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے الہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا کیونکہ ''الہ'' کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پر نہیں کر سکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں، اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کیسوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں، جیسے کوئی بے بچہ کی ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبا لے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے، یک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اس کی زندگیمیں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ء میں جب پنڈت جوہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:۔

''میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا، اس میں کی ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا، کتاب زندگی کے اگلے ورق سر بمہر ہیں۔''

nehru-autobiography(london)
1953)p.597)

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب

سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں، اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلا شرکت حکومت کر رہے ہیں، مگر اس یافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتاب زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا، جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے، جنوری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

''میں ایک سیاست دان ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، اور ہم کیا کر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں۔'' (national herald,jan.6,1964

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا ہوا ہے جنھوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا، دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دل چسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں، مگر یہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سیزور کرنا شروع کر دیتی ہے، اور انھیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

خدا سے محروم قلوب کا یہ حال صرف ایک دینوی بے اطمینانی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے، یہ چند روزہ مسئلہ نہیں بلکہ دائمی مسئلہ ہے یہ دراصل اس تاریک اور بے سہارا زندگی کے آثار ہیں جس کے کنارے وہ کھڑا ہوا ہے، یہ اس ابتدائی زندگی کی ابتدائی گھٹن ہے جس میں ایسے ہر آدمی کو موت کے بعد داخل ہونا ہے، اور اس خطرے کا ایک پیشگی الارم ہے جس میں اس کی روح کو بالآخر

مبتلا ہونا ہے، مختصر یہ کہ وہ اس جہنم کا دھواں ہے جو ہر کافر و مشرک کے لئے تیار کی گئی ہے گھر میں آگ لگ جائے تو اس کا دھواں سوتے ہوئیدماغ میں گھس کر اس کو آنے والے خطرے سے باخبر کرتا ہے، اگر وہ دھوئیں کی گھٹن سے جگ گیا تو اپنے آپ کو بچالے جائے گا، لیکن جب شعلے قریب آجائیں تو وہ انتباہ کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمھاری بے حسی اور بے خبری نے تمھارے لئے مقدر کر دیا ہے کہ تم آگ میں جلو۔

کیا کوئی ہے جو وقت سے پہلے بیدار ہو جائے، کیونکہ بیداری وہی ہے، جو وقت سے پہلے ہو، وقت پر بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

۲۔ میگ گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (michael brecher.) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کیتھی، نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ جون ۱۹۵۶ کو انھوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:۔

''آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں، اور آپ کا بنیادی فلسفہ زندگی کیا ہے؟''

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:۔

'' میں کچھ میعاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی میعار (moral standards.) کہہ لیجئے یہ میعار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، ان میعاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم، ایک مذہبی نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ اپنے تمام، رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے، میں اخلاقی اور

روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں، لیکن
میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے
یہ مسئلہ ہے۔''

(nehru:a political biography(london,1959)p.1607-8.)

یہ سوال و جواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے، افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک کاص میعار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا، مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے سینکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے، پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ (courtesy week.) منایا جاتا ہے، مگر اس کے بعد بھی سرکاری ملازمتوں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے ''اخلاق'' کا حوالہ دینا کافی نہیں، بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ ''بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔'' (ticketless travel social evil.) مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ [سماجی گناہ'' کا لفظ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتا جو نظم و ضبط کی تعمیل کے لئے محرک بن سکے، پریس کے ذریعہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا (crime does not pay.) مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے کہ دینوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو جرم سے باز رکھے، تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کر دی جاتی ہیں ۔۔۔ رشوت دینا پاپ ہے۔'' مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انھیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور و شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے

رشوت کو روکنے میں کسی درجہ بھی مفید نہیں ہیں، ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں۔۔ ''ریلوے قوم کی ملکیت ہے، اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے'' مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں، اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں، تو یہ اسبات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ''قوم'' کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دے'' اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا ملک وقوم سے غداری ہے'] ایک طرف سے لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے، دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشیش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہوگئی ہے جو قومی تعمیر کے لئے ضروری ہیں، اور ان میعاروں کو پیدا کرنے کے لئے جتنے جتنے ذرائع استعمال کئے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لا کر ڈال دیا ہے، اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن وخوبی طے کر سکتی ہے زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہوگئی ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے، وہ زندگی کے لئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے، یہی وہ تنہا بنیاد ہے جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے، اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر چسٹر باولز (chester bowles.) لکھتے ہیں:۔

''زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے مسائل سے دو چار ہیں اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں، ایک یہ کہ

سرمایہ، خام اشیاء اور فنی مہارت جو انھیں حاصل ہیں، ان کو کس طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں۔۔۔ دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اور ادارہ سے ہے، صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ یقین بھی حاصل کرنا ہے کہ وہ جتنی خرابیوں کو ے زیادہ خرابیاں پیدا نہ کردے، مہاتما گاندھی کے الفاظ میں

''سائنسی معلومات اور دریافتیں محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہوسکتی ہیں، اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے۔''

(the makings of a just society(delhi1963)pp.68-69)

باولز کے الفاظ میں عوام گویا وہ ماحول ہے جس کیاندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں، ترقی کے ضروری سامان۔۔سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتے۔(صفحہ ۳۱)

یہ خلا کیسے پر ہوا اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانت داری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں، اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہوسکتا، بے خدا تہذیب کے اندر ہر رقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے، اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوش حال سماج کی تعمیر کی جائے، مگر اسی کے ہاتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ۔۔۔''انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے'' تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کردیتے ہیں، وہ پورے سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں، سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

مادی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش

پوری کرنا چاہیے لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کئے بغیر یکساں طور پر اپنی اپنی خواہشیں پوری کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسروں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے، فرد کی خوشی، سماج کی خوشی کو درہم برہم کر دیتی ہے، ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہو رہی اری، بد دیانتی، چوری، رشوت اور غبن کے ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے، مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔

جدید دنیا ایک عجیب وغریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، یہ جرم کم سنی (juvenile delinquency.) ہے، جو جدید زندگی کا ایک لازمہ بن چکا ہے یہ کم سن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے، ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں اور اپنی جنسی خوشی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں اور اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں، اس علیحدگی کی قیمت سماج کو چند ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے، جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں ''یتیم'' ہو گئے ہیں یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماحول سے بے زار، یہ صورت حال بہت جلد انھیں جرائم تک پہنچا دیتی ہے، سر الفرڈ ڈ ینگ (alfred denning.) نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (broken homes.) سے نمودار ہوتے ہیں۔''

(the changing law,p.111.)

اسی طرح موجودہ زندگی میں تمام خرابیوں کی جڑ صرف یہ واقعہ ہے کہ جدید دنیا کا انفرادی فلسفہ اور اس کے اجتماعی مقاصد ایک دوسرے سے متضاد ہیں، وہ تمام واردات جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں، اور ان کو جرم، برائی، اور بدعنوانی کہتے ہیں، وہ دراصل کسی شخص یا پارٹی، یا قوم کی اپنی مادی خوشی حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے اور اسی کوشش کا سماجی انجام قتل، بدکاری، لڑائی، اغوا، جعل سازی، ڈاکہ، لوٹ گھسوٹ، جنگ اور اس طرح کی بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتاتا ہے کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی مادی چیزوں کی بجائے آخرت میں خدا کی خوش نودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے، یہی وہ مقصد ہے، جو فرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچا کر متوافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔۔۔نظریہ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے کہ وہی وہ واحد بنیاد ہے، جو ترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کرسکتی ہے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ وہی حقیقی مقصد ہے، کیونکہ غیر حقیقی چیز زندگی کے لئے اتنی اہم اور اس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔

موجودہ زمانے میں طب اور سرجری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے یہ خیال کیا جانے لگا کہ سائنس موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پاسکتی ہے مگر اسی کے ساتھ بیماری کی اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔عصابی بیماری (nervous diseases.) یہ ''اعصابی بیماریاں'' کیا ہیں، یہ دراصل اسی تضاد کا عملی ظہور ہے، جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے، مادی تہذیب نے انسان کے اس حصے کو جو نمکیات، معدنیات، اور گیسوں کا مرکب ہے ترقی دینے کی کافی کوشش کی، مگر انسان کا وہ حصہ جو شعور، خواہش، اور ارادے پر مشتمل ہے، اس کی غذا سے اس کو محروم کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا، مگر دوسرا حصہ جو اصل انسان ہے، وہ طرح طرح کے عوارض

میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکہ کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اسی ۸۰ فی صدی مریض ایسے ہیں جن کی علامت بنیادی طور پر نفسیاتی سبب (phychic causation.) کے تحت واقع ہوتی ہے، ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کیں ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجود یہ ہیں، جرم، ناراضگی، اندیشہ، پریشانی، مایوسی، ، تذبذب، شبہ، حسد، خودغرضی اور اکتاہٹ (boredom.) یہ سارے عوارض، اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو بے خدا زندگی کا نتیجہ ہیں خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے، جو مشکلات میں اس کے لئے سہارا بن سکے وہ ایسا برتر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے، جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے، وہ عقیدے کی وہ طاقت دیتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سر ولیم اوسلر (sir william osler.) نے کہا ہے ''وہ ایک عظیم قوت محرکہ (great moving force.) ہے، جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور نہ لیبورٹری میں اس کی آزمائش کی جا سکتی ہے'' یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے، جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ ''بیماریوں'' کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہو سکتی، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وقت کے ماہرین نے نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں کمال درجے کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے مگر ان نو دریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں، ایک عسائی عالم کے الفاظ میں'' نفسیاتی علاج کے ماہرین (psychiatrists.) صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں، جو ہمارے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والا ہے۔''

جدید معاشرہ بے یک وقت دو متضاد عمل کر رہا ہے، ایک طرف وہ مادی سازو سامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کر رہا ہے، دوسری طرف مذہب کو ترک کر کے وہ حالات پیدا کر رہا ہے جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائے، وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے، اور دوسری جانب زہر کا انجیکشن دے رہا ہے یہاں میں ایک امریکی ڈاکٹر ارنسٹ اڈولف (paul ernest adolph.) کا ایک اقتباس نقل کروں گا جو اس سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:۔

جن دنوں میں میڈیکل سکول میں زیر تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا جو زخم ہو جانے کی صورت می جسم کے اخلاط (body tissues.) میں رونما ہوتی ہیں، خوردبین کے ذریعے نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش اندمال ہو جاتا ہے، اس کے بعد جب تعلیم ختم کر کے میں عملاً ڈاکٹری کے پیشے میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ میں زخم اور اندمال کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کر سکتا ہوں جب کہ میں اس ضروری طبی وسائل مہیا کر کے اس کو استعمال میں لاؤں، لیکن جلد ہی میری اس خود اعتمادی کو صدمہ پہنچا، مجھے محسوس کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا، جو سب سے زیادہ اہم ہے۔۔۔یعنی خدا۔

ہسپتالوں میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ان میں ایک ستر ۷۰ سال کی بوڑھی عورت تھی جس کا کولہا زخمی ہو گیا تھا، اکسیرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کی نسیجیں (tissues.) بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہیں، میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارک باد پیش کی، انچارج سرجن نے مجھے

ہدایت کی کہ اس خاتون کو ۲۴ گھنٹوں میں رخصت کر دیا جائے، کیونکہ ابوہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی ہے۔

اتوار کا دن تھا اسکی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی، میں نے اس سے کہا کہ چونکہ اس کی ماں اب صحت یاب ہے، اس لئے وہ کل آ کر اسے ہسپتال سے لے جائے ،لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے، اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر نہ لے جاسکیں گے، اس لئے زیادہ بہتر انتظار کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی دارالضعفاء(old peoples.) میں پہنچا دیا جائے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ مرگئی۔۔کولھے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمے کی وجہ سے(not of her broken hip,but of a broken heart.) ہم نے کسی قسم کی ممکن طبی امداد اسے پہنچائی، مگر وہ جان بر نہ ہوسکی، اس کے کولھے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بالکل درست ہو چکی تھی مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا، ، وٹامن، معدنیات، اور توٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لئے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود صحت یاب نہیں ہوئی یقینی طور پر اس کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں، اور وہ ایک مضبوط کولھے کی مالک ہو چکی تھی، مگر وہ بچ نہ سکی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کی صحت کے لئے اہم ترین عنصر جو درکار تھا، وہ وٹامن نہیں تھا نہ معدنیات تھے، نہ ہڈیوں کا جڑنا تھا، یہ صرف امنگ(hope.) تھی، اور جب زندگی کی امنگ ختم ہوگئی تو صحت بھی رخصت ہوگئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ مجھے یہ شدید احساس تھا

کہ اس بوڑھی خاتون کے ساتھ ہرگز یہ حادثہ پیش نہ آتا، اگر یہ خاتون خدائی امید
( ) سے آشنا ہوتی، جس پر ایک عیسائی کی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔''
(the evedence of god ,pp.212-14.)

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید تقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے، وہ ایک طرف سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہی ے، جس سے خدا کا وجود حرف غلط ثابت ہو جائے، تعلیم وتربیت کے پورے نظام کو اس ڈھب سے چلایا جا رہا ہے جس سے خدا اور مذہب کے احساسات دلوں سے رخصت ہو جائیں، اس طرح روح اصل انسان۔۔کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم۔۔ مادی وجود۔۔کو ترقی دینے کی سعی کی جارہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ عین اس وقت جب کہ بہترین ماہرین اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت کی محرومی کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہی وہ تضاد ہے، جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے، خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں، عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگ مگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شان دار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں۔۔۔غرض مادی ترقیات کے باوجود زندگی بالکل اجڑ گئی ہے، اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا۔۔۔انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لئے مہیا کیا تھا۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے، نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (c.g.jung.) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے، میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہونچنے والے تمام لوگ۔۔۔ جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جاسکتی ہے۔۔۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا، جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیے میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری ایک تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب میں ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں، اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقتہ اسوقت تک شفایاب نہ ہوسکا، جب تک اسنے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا۔''

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کے لئے بجائے خود واضح ہیں، تاہم اگر میں نیو یارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے، کریسی مارلسن کے الفاظ نقل کردوں تو بات بالکل مکمل ہوجائے گی:۔

''ادب و احترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات () کہا جاسکتا ہے، وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خوردبینی کی عجیب وغریب قسم ہے، جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھالیتا ہے، عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہوجائے گی، نظم، بے نظمی میں تبدیل ہوجائے گی، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہوجائے گا۔۔۔ اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں۔''

(Man does not stand alone,p.123.)

فٹ نوٹ

صفحہ نمبر:۔۱۹۵:۱۔ text book of jurisprudence,p15.

۲۔ (the changing law ,p.103.

صفحہ نمبر۲۰۵:۱۔ انفرادملکیت کا نظام جو ساری دنیا میں جاری ہوا وہ دراصل مذہب ہی کے اثر کا نتیجہ تھا اور اسی لئے مارکس اور اس کے متبعین نے مذہب کی شدید مخالفت کی کیونکہ اس کے بغیر وہ انفرادی ملکیت کی اہمیت کو ذہنوں سے نکال نہیں سکتے تھے۔

صفحہ نمبر۲۲۲:۱۔ quoted by c.a.coulson,science and christian belief,p.110.

آخری بات!

اگر کسی دن ماونٹ پیلومر کی رصد گاہ سے یہ اعلان ہو کہ زمین کی قوت کشش ختم ہوگئی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا، کیونکہ اس کی خبر کے معنی یہ ہیں کہ زمین کا پورا کراہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھینچنا شروع ہو جائے گا اور چند ہفتوں کیاندر سورج کے عظیم الاؤ میں اس طرح جا گرے کہ اس کی راکھ بھی بتانے کے لئے باقی نہ رہے کہ زمین نام کی کوئی چیز کبھی اس کائنات میں موجود تھی، جس میں اربوں انسان بستے تھے، اور بڑے بڑے تمدنی شہر آباد تھے۔

مگر ماہرین اعداد و شمار کی یہ خبر کہ ہر ایک منٹ میں ساری دنیا کے اندر ایک سو انسان مر جاتے ہیں، ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ گھبرا دینے والی بات ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر ایک رات اور دن میں تقریباً پندرہ لاکھ انسان ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔۔۔ ۲۴ گھنٹے میں پندرہ لاکھ! اس صورت حال میں یہ واقعہ مذید شدت پیدا کر دیتا ہے کہ پندرہ لاکھ کا یہ انتخاب تاب کار عناصر کے برقی ذرات کی طرح بالکل نامعلوم طور پر ہوتا ہے کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے لئے جن پندرہ لاکھ انسانوں کی موت کی فہرست تیار ہو رہی ہے، اس میں اس کا نام شامل ہے یا نہیں، گویا ہر شخص ہر آن خطرے میں مبتلا ہے کہ قضاء قدر کا فیصلہ اس کے حق میں موت کا فرشتہ بن کر آ پہنچے۔

یہ جانے والے لوگ کہاں جاتے ہیں، اس کا جواب آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کائنات کے مالک کے سامنے اپنے کارنامہء زندگی کا حساب دینے کے لئے حاضر کئے جاتے ہیں، انھیں اس لئے موت آتی ہے کہ دوسری دنیا میں ان کی وہ مستقل زندگی شروع ہو جو دنیا کے عمل کے مطابق اچھی یا بری انھیں گزارنی ہے، یہ زندگی یا تو بے حد آرام کی زندگی ہے، یا بے حد تکلیف کی زندگی، یہ گھڑی بہر حال آ کٹ رہے گی، ہم سب لوگ ایک ایسے ممکن انجام سے دو چار ہیں جس سے صرف ہم بچنے کی

فکر کر سکتے ہیں، اس کے آنے کو ہم ٹال نہیں سکتے۔

پھر انسان تو کس انتظار میں ہے کیا تجھ کو ہوشیار کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی نہیں کہ تو اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا، کیا تجھے اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے اس سے بڑے کسی محرک کی ضرورت ہے کہ اگر تو نے دنیا میں اپنی زندگی نہیں بدلی تو تجھ کو جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیش کے لئے جلنا ہے کیا تو اس سے نہیں ڈرتا کہ دنیا میں جب تیری قبر پر تیرے معتقدین پھول چڑھا رہے ہوں تو آخرت میں خدا کے فرشتے تیری باغیانہ روش کے جرم میں تجھ پر کوڑے برسائیں۔

وہ دن جو بڑا سخت دن ہوگا، وہ جب آئے گا تو سارے زمین و آسمان کو الٹ دے گا، وہ ایک نئی دنیا بنائے گا جہاں سچ سچ کی شکل میں ظاہر ہوگا اور جھوٹ جھوٹ کی شکل میں، کوئی نہ خود دھوکے میں رہے گا، اور نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکے گا، نہ کسی کا زور چلے گا، نہ سفارش کام آئے گی، اس دن تیرے الفاظ کے گھروندے بکھر جائیں گے، تیرے جھوٹے فلسفے بے دلیل ثابت ہوں گے، تیری فرضی امیدیں تجھے دھوکہ دے دیں گی، تیرا اقتدار تیرے کچھ کام نہ آئے گا، تیرے خود ساختہ بت تجھے دھوکہ دے دیں گے، آہ! انسان کس قدر بے سہارا ہوگا، اس روز، حالانکہ اسی دن اس کو سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی، وہ کتنا محروم ہوگا، اس روز، حالانکہ اسی دن وہ سب سے زیادہ پانے کا محتاج ہوگا۔

انسان آج ہی سن لے، کیونکہ کل تو سنے گا مگر اس وقت تیرا سننا بے کار ہوگا، آج ہی سن لے کیونکہ موت کے بعد تو سوچے گا مگر اس وقت کا سوچنا تجھے کچھ کام نہ آئے گا، خدا کا راستہ تیرے سامنے کھلا ہوا ہے، اس کو پکڑ لے، خدا کے رسول پر ایمان لا، خدا کی کتاب کو اپنی زندگی کا دستور بنا، آخرت کے دن کے لئے تیاری کر۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے، اسی میں وہ زندگی چھپی ہوئی ہے، جس کی تجھے تلاش ہے۔

---------The End---ختم شد----------